ماہنامہ

تحقیقاتِ اسلامی

URDU MONTHLY MAGAZINE

مُدیرمسئول

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

مُدیر تحریر

مولانا محمد صغیر قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن دعوت الی الحق کیرانہ ضلع شاملی کا

علمی، دینی، تحقیقی واصلاحی ترجمان

ماہنامہ

تحقیقاتِ اسلامی

جلد (۱۱) ربیع الاول ۱۴۴۶ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۲۴ء شمارہ (۳)

مدیر مسئول

حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

بانی ومہتمم جامعۃ السعادۃ کیرانہ وصدر انجمن دعوت الی الحق

مدیر تحریر

محمد صغیر قاسمی

09897855010

sagheerqasmi@gmail.com

ترسیل کے لیے رابطہ کریں: محمد معظم رحمانی قاسمی 09359602830

موبائل نمبر: 09359602830 ای میل: tahqiqateislami2011@gmail.com

شرح خریداری:

فی شمارہ: ۳۰/روپے سالانہ: ۳۰۰/روپے اعزازی: ۵۰۰۰/روپے

ادارہ کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ہر طرح کی قانونی کارروائی کا حق صرف عدالتِ کیرانہ ہی کو ہوگا۔

خط وکتابت کا پتہ:

دفتر ماہنامہ "تحقیقاتِ اسلامی"

جامعۃ السعادۃ

محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ کیرانہ ضلع شاملی (یوپی) انڈیا

Add: Office Tahqiqat-e-Islami
Jamiatus Sa'adah, Moh.Ibrahimpura
(Aal Kalan) Shamli Road, Kairana
Distt. Shamli (U.P.) India
A/c No. 3023002100004803
TAHQIQAT-E-ISLAMI
Punjab National Bank, Branch: Kairana

ناشر

تحقیقاتِ اسلامی

۲۴۱ آل خورد (ملتانیان) کیرانہ ضلع شاملی (یو۔پی) ۲۴۷۷۷۴

پرنٹر پبلشر محمد عرفان نے جیوتی پرنٹنگ پریس منگلا مارکیٹ نزد مالویہ چوک، مظفرنگر سے طبع کرا کے دفتر تحقیقاتِ اسلامی ۲۴۱ آل خورد (ملتانیان) کیرانہ شاملی سے شائع کیا۔

آئینہ

صریر خامہ

رحمت عالم — محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی — (۳)

درس قرآن

تفسیر سورہ نباء — مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی — (۶)

درس حدیث:

دور حاضر اور علامات قیامت: — محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی — (۹)

خوشگوار ازدواجی زندگی — مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی — (۱۱)

مقالات ومضامین:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت — مولانا عبید اللہ خالد صاحب — (۱۴)

عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم — مولانا سفیان علی فاروقی — (۱۹)

سیرت نبوی اور ہمارا طرزِ عمل — مولانا زاہد کھیالوی — (۲۳)

باہمی اختلاف اور ملت کی ذمہ داری — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی — (۲۶)

وقت ایک فلسفہ علم وآگہی — مولانا محمد سفیان قاسمی — (۲۹)

وقف کی اہمیت اور ترمیمی بل ۲۰۲۴ء — مفتی امانت علی قاسمی — (۳۴)

بچوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت (قسط:۱) — ڈاکٹر ساجد خاکوانی — (۳۹)

فقہ وفتاوی

کیا جنت کی نعمتیں صرف مردوں کے لیے ہیں؟ — ادارہ — (۴۲)

افسانہ

ماں جی (قسط:۱) — قدرت اللہ شہاب — (۴۵)

طب وصحت

گہری و پرسکون نیند کیسے حاصل کی جائے؟ — ادارہ — (۴۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صریر خامہ

رحمت عالم

محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی

نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم اما بعد!

رحمت عالم محسن انسانیت فخر دو جہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد نے سسکتی اور دم توڑتی انسانیت کو یہی نہیں کہ حیات جاودانی عطا فرمائی، بلکہ انسان کو انسان بنایا، اسے جینے کا سلیقہ عطا فرمایا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے اس کے خالق و پالنہار سے ملایا، ورنہ وہ اپنے قول و عمل سے ایک حیوان اور درندہ بن چکا تھا۔ وہ اپنی ہی کوکھ سے پیدا ہونے والی بچیوں کو زندہ درگور کر دیتا تھا، وہ عورتوں کو جینے کا حق نہیں دیتا تھا اور اگر کوئی بچ گئی تو وہ صرف مردوں کی خواہشوں کی تکمیل کا سامان ہوتی تھی، اسے نہ مکان ملتا تھا نہ جائیداد۔ بلکہ بعض اقوام تو اسے شوہر کی موت پر، اس کی چتا کے ساتھ زندہ جل جانے پر مجبور کرتیں تھیں۔ مرنے والے کے اگر نابالغ بچے ہوتے تو ان بچوں کو باپ کی میراث سے محروم کر دیا جاتا اور بالغ لوگ پورے مال پر قبضہ کر لیتے۔ بوڑھوں پر ظلم و زیاتی کی جاتی۔ لاوارث اور بے بس انسانوں کو غلام بنالیا جاتا، اور ان کے ساتھ حیوانوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا۔

گویا جینے کا حق صرف اور صرف طاقت ور اور جوانوں کو تھا۔ مظلوموں و بیکسوں اور پریشان حال لوگوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ اس کے یہاں نہ اپنوں کے لئے حقوق تھے اور نہ غیروں کے لئے۔ وہ مال دولت کا حریص، عہدہ و منصب کا طالب اور قوت و غلبے کا بھوکا تھا، اور اس کے لئے جس بھی غیر انسانی سطح پر جانا پڑے چلا جاتا تھا۔

نسلی غرور اور طاقت کا بھوت ایک دوسرے کو نگلے جا رہا تھا۔ بادشاہوں کے بے لگام اقتدار اور امراء کے بے رحم اختیار نے انسان کے جسم اور رُوح، ذہن اور فکر کو بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، عدالتی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں مکمل جابرانہ نظام نافذ تھا، ضمیر مردہ ہو چکا تھا، نیکی کا نام باقی نہ تھا، عقل اور فہم پر جہالت، خوف، ظلم و جبر اور وہم کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ فطری آزادیاں ناپید تھیں۔ وحشت و بربریت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ حیاتِ انسانی پر مسلط تھی۔ خوف و ہراس، ناکامی اور نامرادی کے گھناؤنے سائے انسانی شعور کے طول اور عرض پر پھیل گئے تھے۔

وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ ہمیں کس نہ پیدا کیا ہے اور کس مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، دیگر حیوانوں کی طرح وہ اپنے آپ کو صرف ایک حیوان سمجھتا تھا۔ جسے نہ جینے کا کوئی سلیقہ تھا، نہ پاکی و ناپاکی اس کے نزدیک کوئی مسئلہ تھا، نہ حلال و حرام سے اسے کوئی سروکار تھا، نہ ظلم و زیادتی سے کوئی چیز اسے مانع تھی۔ بس اپنی طاقت و قوت سے جو پایا ہضم کر گیا اور جس طرح

زندگی گزری، گذارکا مرگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت دم توڑ چکی تھی اور ظلم وجور کی چکی میں پس رہی تھی، نفسی نفسی کا عالم تھا، پیدا کرنے والی ذات سے کوئی تعلق باقی نہ رہ گیا تھا، وہ پتھروں اور درختوں کو سجدہ کرنے اور اس کے سامنے ماتھا ٹیکنے کو فخر سمجھتا تھا اور انبیائے سابقین کی تعلیمات کو فراموش کر بیٹھا تھا کہ رحمت الٰہی جوش میں آتی ہے اور انسانوں کو انسانیت کا درس دینے کے لئے ساقیٔ کوثر، شافعِ محشر، محبوبِ ربّ العالمین، سیّد المرسلین، خاتم النبیّین، رحمۃ للّعالمین، سرورِ کونین، بشیر ونذیر، سراجِ منیر، امام الانبیاء، آفتابِ دوعالم، حضرت محمّد مصطفیٰ، احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور ہوتا ہے۔

بس پھر کیا تھا؟ سب کو پیام رحمت ملتا ہے، انقلاب کی موجیں بلند ہوتی ہیں اور خوف وغم، ظلم واستبداد، شرک وکفر کو تنکوں کی طرح بہالے جاتی ہے۔ امن وسکون، راحت ومسرت، آزادی اور حریت کی باد بہاری چل پڑتی ہے، غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں، پیٹھ کا بوجھ گر جاتا ہے، ذہنی بندش اور فکری بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ شخصی برتری اور نسلی غرور کا تصور پیروں تلے روند دیا جاتا ہے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس رحمت کی ایک گھٹا تھی جو خشک آسمانوں پر پھیل گئی اور تپتی ہوئی انسانیت پر برس کر سبزہ وگل کی افزائش کا سبب بنی، یا نور کی ایک کرن تھی، جو اندھیروں کو چیرتی ہوئی دُنیا کے پردے پر آپڑی اور ایک عالم کو منور کر گئی، یا وہ روشنی کا ایک مینار تھی جو طوفان خیز سمندروں سے اُبھری اور تاریک فضاؤں میں بلند ہوکر انسانیت کے سفینے کو نشان راہ دکھانے لگی! چودہ صدیاں ختم ہوگئی ہیں لیکن روشنی کا یہ مینار اپنی جگہ موجود ہے اور قیامت تک انشاءاللہ موجود رہے گا۔

آپ نے آکر بندے کو اس کے خالق سے ملایا، اسے بتایا کہ ایک خدائے رب کریم کے علاوہ کسی کی عبادت اور سجدہ جائز نہیں ہے۔ اسے رب کائنات کی تعلیمات سے آگاہ فرمایا، آپ نے آکر انسان کو انسان بنایا، اسے اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، آپ نے علم وتمدن سے آگاہ کیا، وفا شعاری وسلیقہ مندی سکھائی بلکہ جینے کا سلیقہ دیا اور بتایا کہ انسان دیگر حیوانات سے جدا ایک مخلوق ہے، اسے خالق نے دیگر حیوانات پر فضیلت دی ہے اور خود اس کے لئے زندگی گذارنے کے اصول وضوابط مقرر کئے ہیں۔ اسے بتایا کہ بہت سے امور اس کے لئے حلال ہیں تو بہت سے کام حرام ہیں، اسے یہ سبق دیا کہ ہر انسان بحیثیت انسان برابر ہے، کسی پر ظلم وزیادتی اگر کوئی کرے گا تو اس کا حساب ہوگا۔ اس کے لئے جنت اور دوزخ بنائی گئی ہے، خدا کے بنائے ہوئے اصول پر چلنے والے کے لئے جنت ہے، جب کہ اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے والے کے لئے جہنم ہے۔

الحاصل آپ نے اپنی جدوجہد سے، اپنے قول عمل سے اور اپنے کردار واخلاق سے دنیا کے سامنے ایسا اسوۂ حسنہ پیش کیا کہ دنیا میں انقلاب آگیا اور انسانوں کو شرفِ انسانی کا حقیقی اندازہ ہوا، کفر وشرک کی تاریکی اور اس کی نحوست مٹ گئی، ظلم وجور کا دور ختم ہوگیا، مظلوموں اور کمزوروں کو انصاف ملا، دنیا ایک نئے تمدن وتہذیب سے واقف ہوئی۔ خزاں رسیدہ

زندگی میں پُرکیف بہار آ گئی، جہالت کی تاریکیاں چھٹ گئی اور علم کی روشنی سے دنیا معمور ہو گئی۔

آج ہم بحیثیت قوم وملّت تعلیماتِ نبوی ﷺ سے انحراف اور شریعتِ محمدی ﷺ سے رُوگردانی کے سبب اس مقام پر ہیں کہ امن ہے، نہ خوش حالی۔ عزّت حاصل ہے، نہ وقار۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ عزّت وعظمت دامنِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستگی میں ہے، آپ ﷺ کی تعلیمات کی پیروی اور آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع ہی دین ودنیا میں فلاح وکام یابی کی کلید، آخرت میں نجات اور ابدی کام رانی کی ضمانت ہے۔ ہماری موجودہ پریشانی اور زبوں حالی کی بنیادی وجہ شریعتِ محمدی ﷺ سے انحراف اور تعلیماتِ نبوی ﷺ کی پیروی نہ کرنا ہے، جب کہ ہماری عظمت و بقا کا راز صرف اور صرف تعلیماتِ نبوی ﷺ کی پیروی میں مضمر ہے۔

مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا آج جس ہلاکت خیز دور سے گذر رہی ہے، جس اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے اور جس طرح ظلم وتعدی کی چکی میں پس رہی ہے، اگر اس سے راہ نجات چاہتی ہے تو وہ صرف آپ ﷺ ہی کی راہ وطریقہ ہے۔ آپ ہی کے طریقے پر چل کر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکتی۔ جب تک رسالت مآب ﷺ کی شریعت پر عمل پیرا نہیں ہو یا جائے گا، آپ ﷺ کی اطاعت ومحبّت ہمارا شعار اور آپ ﷺ کی تعلیمات کی پیروی کو ضابطۂ حیات نہیں بنایا جائے گا، دنیا موجودہ مشکات سے نجات نہیں حاصل کر سکتی۔

****

تحقیقاتِ اسلامی محض ایک ماہ نامہ یا رسالہ نہیں ہے، بلکہ ایک دینی، علمی، اصلاحی اور فکری تحریک ہے، جس کا مقصد مغربی تہذیب اور اس کے عریاں وفحش لٹریچر سے متأثر افراد کے رُخ کو موڑ کر قرآن وحدیث کی تعلیمات اور اسلامی تہذیب وتمدن کی جانب مائل کرنا ہے۔

قارئین حضرات سے درخواست ہے کہ اس تحریک سے جڑیں، گھر گھر اسے پہنچانے میں ہمارا تعاون کریں اور لوگوں کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دیں۔ (ادارہ)

درس قرآن کریم

سورۃ النباء

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِىْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ: یہ (کافر) لوگ کس چیز کے بارے میں سوالات کررہے ہیں؟ (۱) اس زبردست واقعے کے بارے میں (۲) جس میں خود ان کی باتیں مختلف ہیں۔ (۳) خبردار! انہیں بہت جلد پتہ لگ جائے گا۔ (۴) دوبارہ خبردار! انہیں بہت جلد پتہ لگ جائے گا۔ (۵)

ماقبل سے ربط

سورۂ نبا کا ماقبل کی ''سورۂ مرسلات'' سے ربط مختلف اعتبار سے ہے۔ ان دونوں سورتوں میں جزا اور سزا کے معاملے کو ''یوم الفصل'' کے آنے کے ساتھ وابستہ کیا ہے، اور تھوڑا سا حال ''یوم الفصل'' کا بھی بیان فرمایا ہے، اور کافروں کو قیامت کے آنے میں جو تعجب ہورہا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت یعنی جزا وسزا کا معاملہ اگر واقعی ہونا ہے تو وہ جلدی اسی دنیا میں کیوں نہیں ہوجاتا؟ ان کے اس تعجب اور شبہے کو بھی اس مقدمے سے دور کردیا کہ قیامت کا وقوع ''یوم الفصل'' کے آئے بغیر نہیں ہوسکتا، اور ''یوم الفصل'' کا آنا موقوف ہے اس کائنات کے فنا ہونے اور نوع انسانی کے انقطاع پر، اس کے بغیر یوم الفصل ممکن نہیں اور یوم الفصل کے بغیر جزاء وسزا کا قیام ممکن نہیں ہے، لہذا اس سے پہلے جزاء وسزا کا مطالبہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے گرمی کے موسم میں جبکہ سردیوں کا موسم نہیں آیا کوئی سردیوں کا پھل مانگے یا جاڑوں میں گرمیوں کا میوہ طلب کرے۔ ظاہر ہے ایسا کرنا حماقت اور بے فائدہ محنت کے سوا کچھ نہیں۔ (تفسیر عزیزی)

وجہ تسمیہ

اس سورت کو سورۂ نبا اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ''نبا'' لغت میں خبر کو کہتے ہیں اور قیامت کی خبر اتنا عظیم مرتبہ اور بڑائی رکھتی ہے کہ گویا اس کے سوا کوئی خبر ہی نہیں، جس کے متعلق پوچھا جائے، اس واسطے اس کو ''نبا عظیم'' فرمایا ہے، یہ خبر اپنی ذات میں بھی عظمت و بڑائی رکھتی ہے، اس کے وقوع میں بھی عظمت ہے اور اس کا سمجھ میں آنا بھی کوئی معمولی بات نہیں بہت بڑی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ خبر کی عظمت یا اس کی ذات کے اعتبار سے ہوسکتی ہے کہ اس کو کوئی عظیم شخص بیان کرتا ہے، یا وہ عظمت

اس خبر کے مضمون کے واقع ہونے کے اعتبار سے ہوسکتی ہے کہ کسی بڑے حادثے پر دلالت کرتی ہے، یا وہ عظمت اس خبر کے احوال وحقیقت سمجھنے کے اعتبار سے ہوسکتی ہے کہ آسانی سے ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتی نہایت دقت سے سمجھی جاتی ہے۔

اور یہ تینوں صفات قیامت کی خبر میں جمع ہیں، اس لئے کہ یہ خبر اس نے دی ہے جو سب سے بڑا ہے یعنی اللہ عزو جل کہ سوائے اس کے کوئی یہ خبر دے نہیں سکتا اور یہ بھی ہے کہ ایسے بڑے حادثے کی خبر ہے کہ اس سے بڑا کوئی حادثہ نہیں ہوسکتا، اور یہ بھی ہے کہ اس کا سمجھ میں آجانا نہایت مشکل ہے، آدمی کی عقل بغیر انوار غیبی کی مدد کے اس کو سمجھ نہیں سکتی، ان وجوہات سے اس خبر میں نہایت عظمت و بزرگی پیدا ہوگئی۔ بس ایسی خبر کے بارے میں دعویٰ کر سکتے ہیں کہ خبر اسی کا نام ہے، باقی سب خبریں ہیچ ہیں، اور جب آپس میں مطلق ''خبر'' کے بارے میں گفتگو ہو تو گویا یہی خبر پوچھی جارہی ہے، لہٰذا جس سورت میں یہ خبر بیان کی جائے اس کا نام بھی خبر (نبا) رکھنا چاہئے۔ (ایضاً)

شانِ نزول

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی تو آپ نے قیامت کا حال بیان فرمایا، کافروں کو یہ بات انوکھی لگی اور تعجب کرتے ہوئے بطور استہزاء کے آپس میں اسکے متعلق کھوج شروع کی، بعض کہتے تھے ''كَيْفَ يُحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ'' ہڈیاں بوسیدہ ہونے کے بعد کیسے زندہ کی جائیں گی۔

بعض کہتے تھے: ''مَتٰى هَذَا الْوَعْدُ'' یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ اور بعض کہتے تھے: ''وَّ مَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً'' (۳۶/ الکھف) (اور میں قیامت کو خیال نہیں کرتا کہ آوے گی)۔ اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ (الانعام: ۲۹) (جینا اور کہیں نہیں صرف یہیں فی الحال کا جینا ہے اور ہم زندہ نہ کیے جاوینگے۔)

خلاصۂ کلام! ان کو اشکال یہ تھا کہ اگر یہ بات ہونے والی ہے تو ایک مرتبہ ہمارے سامنے ہو کیوں نہیں جاتی؟ اچھے اور بروں کو ان کے کاموں کے موافق بدلہ دینے کے لئے اس دن کے انتظار کی کیا ضرورت ہے؟ اس دنیا میں ہی بدلہ کیوں نہیں دے دیتے کہ لوگوں کو عبرت بھی ہو، نصیحت پکڑیں اور برے کاموں سے باز آجائیں اور نیک کام کرنے لگ جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ سب باتیں رد کر کے جزا وسزا کو قیامت پر موقوف رکھنے کا سبب بیان فرمایا ہے۔ اور یہ سورت نازل کی ہے۔ (ایضاً)

تشریح وتفسیر

''عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝''.

(یہ [کافر] لوگ کس چیز کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں؟ اس زبردست واقعے کے بارے میں۔ جس میں

خود ان کی باتیں مختلف ہیں۔خبردار!انہیں بہت جلد پتہ لگ جائے گا۔ دوبارہ خبردار!انہیں بہت جلد پتہ لگ جائے گا۔)

لفظ''عَمَّ''دوحرفوں سے مرکب ہے،''عَنْ''اور''مَا''سے،حرف''مَا''استفہام کے لئے آتا ہے۔اس ترکیب میں حرف''مَا''میں سے الف ساقط کردیا گیاہے،معنی یہ ہوئے کہ یہ لوگ کس چیز میں باہمی سوال و جواب کررہے ہیں۔پھر خود ہی اس کا جواب دیا گیا: یہ اہل مکہ اس عظیم الشان خبر یعنی قیامت کے بارے میں بحث اور سوال و جواب کررہے ہیں، جس میں ان کے آپس میں اختلاف ہورہا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جب قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا،تو کفار مکہ اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر اس کے متعلق رائے زنی اور چہ میگوئیاں کیا کرتے تھے۔قرآن میں قیامت کا ذکر اہمیت کیساتھ آیا ہےاوران کے نزدیک گویا یہ محال چیز تھی،اس لئے اس میں گفتگو بکثرت چلتی تھی،کوئی تصدیق کرتا کوئی انکار،اس لئے اس سورت کے شروع میں انکا یہ حال ذکر کر کے آگے قیامت کا واقع ہونا مذکور ہے اور ان کے نزدیک جو اس کے واقع ہونے میں اشکال واستبعاد تھا اس کا جواب دیا گیااور بعض حضرات مفسرین نے فرمایا کہ یہ سوال جواب کوئی واقعی تحقیق کے لئے نہیں تھا، بلکہ محض استہزاو تمسخر کے لئے تھا۔واللہ اعلم۔قرآن کریم نے ان کے جواب میں ایک ہی جملہ کو تاکید کے لئے دو مرتبہ فرمایا:

''كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝''(خبردار!انہیں بہت جلد پتہ لگ جائے گا۔دوبارہ خبردار!انہیں بہت جلد پتہ لگ جائے گا۔)یعنی یہ سوال و جواب اور بحث و تحقیق سے سمجھ میں آنے والی چیز نہیں،وہ تو جب سامنے آئے گی اس وقت حقیقت معلوم ہوگی۔یہ ایک ایسی یقینی چیز ہے جس میں بحث و سوال اور انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔پھر فرمایا کہ اس کی حقیقت خود ان لوگوں پر عنقریب واضح ہوجائے گی یعنی مرنے کے بعد ان کو دوسرے عالم کی چیزوں کا انکشاف ہوگا اور وہاں کے ہولناک مناظر کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے اس وقت حقیقت کھل جائے گی۔ (جاری)

****

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع وانکساری

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرید منشی محمد قاسم کو لکھتے ہیں جن کو ابھی مرید نہیں بنایا ہے:''یہ ناکارہ ہر چند بظاہر متہم نیکی کے ساتھ ہوا،مگر حقیقت حال عالم الغیب خوب جانتا ہے،تم اپنے واسطے شیخ کامل کی تلاش رکھو۔یہ عاجز خود درماندہ شرمندۂ بارگاہِ خداوندی خود لائق اس کے ہے کہ کوئی خدا کا بندہ خدا کے واسطے اس کی دستگیری کرے۔''(مکتوب سوم،ص:۲۸ بحوالہ اکابر کا مقام تواضع،ص:۱۰۳)

درس حدیث

دورحاضر اور علامات قیامت

محمد صغیر قاسمی پرتاپ گڑھی

زنا سے پیدا ہونے والی اولادوں کی کثرت ہوگی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالی عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"یَا ابْنَ مَسْعُودٍ، إِنَّ مِنْ أَعْلَامِ السَّاعَةِ وَأَشْرَاطِهَا أَنْ يَكْثُرَ أَوْلَادُ الزِّنَا۔ (طبرانی اوسط: ۴۸۶۴)

(اے ابنِ مسعود! بے شک قیامت کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اولادِ زنا کی کثرت ہوجائے گی۔)

ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ جب زنا اور اولاد الزنا کی کثرت ہوجائے گی تو امت سے خیر و برکت اٹھالی جائے گی اور پھر عمومی عذاب میں یہ امت مبتلا کردی جائے گی:

عَنْ مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يَقُوْلُ: لَا تَزَالُ أُمَّتِي بِخَيْرٍ مَا لَمْ يَفْشُ فِيهِمْ وَلَدُ الزِّنَا، فَإِذَا فَشَا فِيهِمْ وَلَدُ الزِّنَا، فَيُوشِكُ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ بِعِقَابٍ۔ (مسند احمد: 26830)

(نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجہ حضرت میمونہ رضی اللہ تعالی عنہا فرماتی ہیں کہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میری امّت ہمیشہ خیر و بھلائی پر رہے گی جب تک کہ اُن میں ولد الزنا (زنا سے پیدا ہونے والے بچوں) کی کثرت نہ ہوجائے، پس جب ولد الزنا پھیل جائیں گے تو اللہ تعالیٰ عنقریب اُن کو عمومی عذاب میں مبتلاء کردیں گے۔)

مستدرک حاکم کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے: "عَنْ مُعَاذِ بْنِ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قَالَ لَا تَزَالُ الْأُمَّةُ عَلَى شَرِيعَةٍ مَا لَمْ يَظْهَرْ فِيهِمْ ثَلَاثٌ: مَا لَمْ يُقْبَضْ مِنْهُمُ الْعِلْمُ، وَيَكْثُرْ فِيهِمْ وَلَدُ الْخُبْثِ، وَيَظْهَرْ فِيهِمُ السَّقَّارُونَ، قَالُوا: وَمَا السَّقَّارُونَ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: بَشَرٌ يَكُوْنُوْنَ فِي آخِرِ الزَّمَانِ تَكُونُ تَحِيَّتُهُمْ بَيْنَهُمْ إِذَا تَلَاقَوْا التَّلَاعُنُ۔ (مسند احمد: ۱۵۰۷۵۔ مستدرک حاکم: 8371)

(حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ امّت اُس وقت تک شریعت پر قائم رہے گی، جب تک کہ اس میں تین چیزیں ظاہر نہ ہوجائیں۔ جب تک کہ ان سے علم کو نہ اُٹھالیا جائے، اور ان میں ناجائز اولاد کی کثرت نہ ہوجائے، اور لعنت باز لوگ پیدا نہ ہوجائیں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: لعنت بازوں سے کیا مراد ہے؟، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آخر زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے، جو ملاقات کے وقت سلام کے بجائے لعنت اور گالی گلوچ کا تبادلہ کیا کریں گے۔)

کسی بھی پودے کی تیاری میں دو چیزیں اہم ہیں: ایک بیج، دوسری زمین۔ اگر دونوں چیزیں عمدہ ہوں گی تو پودا

سرسبز وشاداب نکلے گا اور خوب پھل دے، اور اگر ان میں سے کوئی چیز خراب ہے تو اولاً پودا اُگے گا ہی نہیں اور اگر اُگ آیا تو مفید وثمر آور نہیں ہوگا۔ انسان کی اولاد بھی ایک طرح کا پھل ہی ہے، جو مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوتی ہے۔ اب اگر دونوں کا ملاپ جائز طریقے پر ہوگا، یعنی نکاح کے بعد، تو ملاپ سے پیدا ہونے والی اولاد با اخلاق، نیک وصالح اور والدین کی فرماں بردار ہوگی۔ اور پھر اپنے اخلاق وکردار سے وہ معاشرے کی فلاح وکامیابی کا ذریعہ بھی بنے گی۔ اور جب معاشرے میں خیر کا غلبہ ہوتا ہے تو رحمت الٰہی جوش میں رہتی ہے اور آسمان سے رحمتوں ونعمتوں کی بارش برسائی جاتی ہے۔ بلائیں ٹال دی جاتیں ہیں اور امن وامان اور خوشحالی کی ہوائیں چلادی جاتیں ہیں۔

لیکن خدانخواستہ مرد وعورت اگر ناجائز طور پر ملاپ کرلیں، تو پھر سمجھ لیں کہ یہ گندا پانی ہے اور اس گندے پانی سے جو اولاد ہوگی وہ بھی گندی ہی ہوگی اور اس سے کسی خیر وبھلائی کی توقع رکھنا فضول ہوگا۔ یہی نہیں کہ یہ اولاد فتنہ وفساد کا سبب بنے گی، معاشرے میں بگاڑ پیدا کرے گی، بلکہ ماں باپ پر بھی ظلم وزیادتی کرے گی۔ اور نظام کائنات ہے کہ جب معاشرے میں فتنہ وفساد عام ہو، ظلم وزیادتی کا دور دورہ ہو تو زمین سے خیر وبرکت اٹھالی جاتی ہے، اور بلائیں، مصیبتیں، بیماریاں وپریشانیاں نازل کی جاتیں ہیں اور امن وامان کو ختم کردیا جاتا ہے۔

دور حاضر میں زنا کی کثرت کا کون انکار کرسکتا ہے؟ ہر معاشرے میں فحاشی وعریانی اور بے حیائی عام ہوگئی ہے، عورتیں بے پردہ بازاروں میں ٹہل رہی ہیں، مردوں وعورتوں کا اختلاط تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ اس پر پابندی لگانے والا دقیانوس سمجھا جاتا ہے۔ مسلمان عورتیں غیر مسلموں سے زنا کروا رہی ہیں، شادی شدہ عورتیں بوائے فرینڈ اور شادی شدہ مرد گرل فرینڈ رکھے ہوئے ہیں۔ پھر کیا آپ سمجھ رہے ہیں کہ اس زنا کے نتیجے میں حرامی اولادیں نہیں پیدا ہو رہی ہیں،؟ ہو رہی ہیں اور خوب ہو رہی ہیں اور ایسی اولادیں بکثرت معاشرے میں موجود ہیں۔ اور جس قدر زنا بڑھے گا اسی قدر حرامی اولادوں کی کثرت ہوگی۔ پھر نتیجہ بھی آپ کے سامنے ہے کہ مصائب وآلام ہیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے ہیں، بیماریاں، مفلسی وغربت، ظلم وزیادتی، مار پیٹ، چوری ڈکیتی، حکومتی سطح پر مظالم، آسمانی آفات وغیرہ کی کثرت یہ سب عذاب الٰہی نہیں ہیں تو کیا ہیں۔

دوسری جو اہم بات بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک دور ایسا آئے گا کہ لوگ آپس میں ملاقات کے وقت بات چیت سلام سے نہیں شروع کریں گے، بل کہ گالی وبدکلامی سے شروع کریں گے۔ افسوس کہ ہمارے معاشرے میں یہ بھی عام ہو رہا ہے۔ نوجوان طبقہ جب اپنے بے تکلف دوستوں سے ملتا ہے، تو سلام کرنے کے بجائے، گالیوں سے بات کا آغاز کرتا ہے اور فخریہ طور پر کہتا بھی ہے کہ ہماری آپس میں بہت زیادہ بے تکلفی ہے، اس لئے آپس میں فری رہتے ہیں۔

تیسری بات یہ بیان کی گئی ہے کہ ''جب تک علم نہ اُٹھالیا جائے''، ظاہر بات ہے جب علم اٹھ جائے گا تو جہالت کا دور دورہ ہوجائے گا اور پھر جہلا جو حرکتیں کرتے ہیں اور معاشرے کے فساد کا جس طرح سبب بنتے ہیں وہ واضح ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اپنا محاسبہ کیا جائے، شریعت کے احکامات پر عمل کیا جائے اور اپنی اولادوں کو دین کی صحیح تعلیم دی جائے ورنہ خدا کے عذاب سے بچنا مشکل ہوگا۔

خوشگوار ازدواجی زندگی
کے رہنما اصول

مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"خَيْرُ كُمْ خَيْرُ كُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُ كُمْ لِأَهْلِيْ۔" [الترمذی، رقم الحدیث: ۳۸۹۵، باب فضل ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۵، ص: ۷۰۹] (تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب میں سب سے زیادہ اچھا ہوں۔)

پرسکون وخوشحال زندگی کے لئے ضروری ہے کہ میاں بیوی کی ازدواجی زندگی خوشگوار ہو، اور دونوں کا ایک دوسرے کے لئے راحت آرام کا ذریعہ بنیں۔ ورنہ گھر آرام وراحت کا مسکن نہیں بلکہ پریشانیوں ومصیبتوں کا مرکز بن جائے گا۔ اور ازدواجی زندگی اسی صورت میں کامیاب اور خوشگوار ہوسکتی ہے جب شوہر اور بیوی میں باہمی تعاون، پیار، انس، اور محبت کامل ترین صورت میں ہو۔ انکے مقاصد واہداف یکساں ہوں۔ شوہر اور بیوی کا رشتہ محض ایک رسمی تعلق نہیں۔ بلکہ انہیں ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح ایک لباس ہمیں زینت بخشتا ہے۔ اسی طرح شوہر اور بیوی کا رشتہ عزت افزائی کا ذریعہ ہے۔ جیسے لباس ہمارے ستر کی حفاظت کرتا ہے۔ جسم کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اسی طرح زوجین ایک دوسرے کے عیوب، خامیوں یا کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔ جیسے لباس ہمیں سرد وگرم سے بچاتا ہے۔ اسی طرح زوجین زندگی کے ہر اونچ نیچ موڑ پر ایک دوسرے کی عزت اور زندگی کی حفاظت کرتے ہیں۔ ارشاد باری ہے:

"هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ۔ [البقرۃ:۱۸۷]

(وہ تمہارے لیے لباس کی مانند ہیں اور تم ان کے لیے لباس کی مانند ہو۔)

شادی کے فوائد اور اس کے مقاصد کو قرآن کریم بیان کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتا ہے کہ میاں بیوی کے درمیان محبت ویگانگت رہے اور دونوں ایک دوسرے کے لئے سامان راحت بنیں نہ کہ پریشانی کا سبب۔

"وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ" [الروم: ۲۱]

(اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے واسطے تمہاری جنس کی بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔)

معلوم ہوا کہ شادی کا مقصد شہوت رانی نہیں ہے، بلکہ پاکیزگی کے ساتھ زندگی کی راحتوں اور مسرتوں کا حصول ہے۔ اور یہ سکون وراحت اسی وقت مل سکتی ہے جب میاں بیوی میں محبت اور یگانگت ہو۔ دونوں کے ایک دوسرے کے حقوق کا پاس ولحاظ کرنے والے ہوں۔ اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ نے ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی سخت تاکید کی ہے اور اور اس بات کا پابند بنایا ہے کہ کوئی کسی کے حق کو، اپنی طاقت وقوت سے ختم کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ارشاد بادی ہے:

"وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (البقرہ:۲۲۸)

(اور عورتوں کے لیے بھی حقوق ہیں جو کہ مثل ان ہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں قاعدۂ (شرعی) کے موافق)

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کی ذمہ داریوں کو چند مختصر الفاظ میں یوں ارشاد فرمایا:

"اَلْمَرْأَةُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَ صَامَتْ شَهْرَهَا وَ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا وَ اَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَائَتْ۔" [حلیۃ الاولیاء، لابی نعیم]

(ایک بیوی جب پنج وقتہ نماز کی پابندی کرے اور رمضان کے روزے رکھے اور اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی خدمت کرے تو اس کو اجازت ہے کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہوجائے۔"

یہاں خواتین کی صرف چار ذمہ داریاں بتائی گئیں ہیں: ۱:-فرض نماز کی ادائیگی۔ ۲:-فرض روزوں کی ادائیگی۔ ۳:-عزت وعصمت کی حفاظت کرنا۔ ۴:-شوہر کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا۔

اس حدیث پاک میں آپ علیہ السلام نے خواتین کو ایک بہت بڑی بشارت سنائی اور وہ یہ ہے کہ جنت کے تمام دروازے اُن کے لیے کھل جائیں گے، اور بدلے میں مطالبہ کسی لمبی چوڑی عبادت کا نہیں کیا، بلکہ فقط فرائض کی ادائیگی جس میں نماز اور روزے کی فرض عبادتیں اور اپنی عصمت کی حفاظت، (جس میں پردہ خاص طور پر) شامل ہے اور آخری اہم بات اپنے شوہر کی خدمت ہے اور شوہر کی خدمت میں وہ تمام کام آجاتے ہیں، جو ایک بیوی اپنے گھر میں انجام دیتی ہے، جس میں بچوں کی پیدائش، اُن کی تربیت، کچن کا انتظام، صفائی کا انتظام وغیرہ شامل ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ جن کاموں کو خواتین خالص دنیوی یا رسمی سمجھتی ہیں اور ایک روٹین یا عادت یا بعض اوقات مجبوری کے تحت کرتی ہیں اُس خالص دنیوی عمل کو "دینِ اسلام" ایک عظیم عبادت قرار دے کر اس کے بدلے اتنی بڑی بشارت سنا رہا ہے۔ سبحان اللہ۔

اس ضمن میں ایک اہم کام خواتین کے ذمے یہ بھی ہے کہ وہ "شکر" کا اہتمام کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی قربانیاں دینے والی فطرت دی ہے، لہٰذا قربانی دینے کے بعد یا خدمت میں کھپ جانے کے بعد بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے ثواب کو بچاتے ہوئے اپنے ذہن اور اپنی زبان کو شکایات پر نہ لگائیں، بلکہ اللہ نے جو بھی دیا ہے اسے غنیمت جان کر اپنے گھر کو خوشحال اور پُرسکون رکھیں، ورنہ وقت بے وقت کی شکایتی راگنی ایک ایسی چنگاری ہے جو پورے گھر کو آگ لگا سکتی ہے، لہٰذا شکر کا خاص طور پر معمول بنایا جائے۔ اس طرح ایک خاتون اپنے گھر کو جنت بنا سکتی ہے، اور اس کے لئے کسی مال

ودولت کی بھی ضرورت نہیں ہے بلکہ فقر وفاقہ کی عین چوٹیوں میں رہ کر بھی یہ سب ہوجانا ممکن ہے۔

ان ذمہ داریوں کے علاوہ بقیہ تمام امور مردوں کے اوپر لازم کئے گئے ہیں، مثلاً کمانے کی ذمہ داری، کھانے پینے کا انتظام، کپڑے اور رہنے کا انتظام، دوا اور علاج کا انتظام اور زندگی کے بقیہ تمام امور کی ذمہ داری شریعت نے مرد پر ڈالی ہے نہ کہ عورت پر۔ ساتھ ہی آپ علیہ السلام نے مرد پر یہ بھی لازم کیا کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک بھی: چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"خَيْرُ كُمْ خَيْرُ كُمْ لِأَهْلِهِ وَأَنَا خَيْرُ كُمْ لِأَهْلِيْ۔" [الترمذی، رقم الحدیث: ۳۸۹۵، باب فضل ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ج:۵، ص: ۷۰۹] (تم میں بہترین شخص وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب میں سب سے زیادہ اچھا ہوں۔)

یعنی اگر تم کماتے ہو اور کھانے پینے یا دیگر اخراجات کا انتظام کرتے ہو تو اس پر اتراؤ نہیں اور اس کی وجہ سے گھر والوں کے ساتھ بدتمیزی نہ کرو، بیوی بچوں اور والدین و دیگر اہل خانہ کے ساتھ تند خو، سخت مزاج یا فوجی بن کر نہ رہو، بلکہ اُن کے ساتھ اچھے سے پیش آؤ اور کوئی اگر باہر کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن گھر میں برا ہے تو وہ برا ہے۔ گھر والوں کے ساتھ اچھا سلوک رکھے اور اس نیت سے رکھے کہ یہ بھی عبادت کا حصہ ہے اور مجھے اس حسنِ سلوک پر نیکیاں مل رہی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے حقوق سے متعلق جو ہدایات ہیں ان میں ایک مجموعی طرزِ فکر یہ ہے کہ خواتین کا مزاج سمجھا جائے اور ان سے اسی کے موافق توقعات رکھی جائیں۔ چنانچہ خواتین کے حوالے سے تین باتوں کا سمجھنا انتہائی ضروری ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ خواتین کس مزاج کی حامل ہیں: ۱:-تحفظ، ۲:-عزت، ۳:-حوصلہ افزائی۔

۱:-تحفظ: بیوی اپنے شوہر سے بھرپور اُمید اور توقع رکھتی ہے کہ میری اور میرے بچوں کی مکمل ذمہ داری میرا شوہر ادا کرے گا اور وہ رہائش، خرچ اور ضروریات کی فکر میں لگے بغیر اپنے گھر کو سنبھالتی ہے، اس کے لاشعور میں یہ کھٹکا رہتا ہے کہ میرا اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں، سوائے میرے شوہر کے، تبھی وہ اپنے شوہر سے بے پناہ توقع رکھتی ہے۔ ۲:-عزت: بیوی اپنی، اپنے بچوں کی اور اپنے والدین کی عزت چاہتی ہے، اسے عزت نہ ملے تو وہ تھوڑا کام کر کے بھی خود کو ایک ملازمہ تصور کرتی ہے اور اُسے عزت مل جائے تو جان کھپا کر بھی فخر کے جذبات رکھتی ہے۔ ۳:-حوصلہ افزائی: بیوی کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے، بلکہ علماء فرماتے ہیں کہ: عورت چاہے کسی بھی روپ میں ہو، ماں، بہن، بیٹی، یا بیوی، اُسے حوصلہ افزائی کی شدید ضرورت ہوتی ہے، یہ اس کی فطری چاہت ہے جسے ختم نہیں کیا جاسکتا اور اگر اُسے جائز طریقے سے حوصلہ اَفزا جملے سننے کو نہ ملیں تو وہ بعض اوقات ناجائز حوصلہ افزائی کی طرف متوجہ ہوسکتی ہے، اسی لیے اس کی پڑھائی، صفائی، کھانا اور خوبصورتی و خوب سیرتی کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے۔

یاد رہے محبت اور اعتماد ازدواجی زندگی کی بنیاد ہے، دونوں کو چاہئے کہ اسے مضبوط رکھیں اور شک وشبہ ہرگز پیدا نہ ہونے دیں اور کبھی ناراضگی یا رنجش ہوجائے تو خاموشی سے دونوں خود ہی اسے نمٹالیں، کسی کو خبر نہ ہونے دیں۔

مضامین ومقالات

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ ولادت
اور عید میلاد النبی کا تحقیقی جائزہ

مولانا عبید اللہ خالد صاحب

یہ ماہ ربیع الاول ہے اور ہر مسلمان جانتا ہے کہ اس ماہ میں سرور کائنات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی اور ساتھ ہی ہر مسلمان عام طور پر یہ بھی جانتا ہے کہ اسی ماہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال اور آپ کی اس دنیا سے روانگی ہوئی اور آپ نے اس دنیا سے پردہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ ولادت کے بارے میں اختلاف ہے۔ چناں چہ آپ کی پیدائش کے حوالے سے زیادہ مشہور، مستند اور معتبر روایت آٹھ ربیع الاول کی ہے اور آپ کی وفات کے حوالے سے مشہور، معتبر اور مستند روایت بارہ ربیع الاول کی ہے۔

چناں چہ جو بڑی عمروں کے لوگ ہیں وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک زمانے میں بارہ ربیع الاول کو بارہ وفات کہا جاتا تھا اور وہ اسی لیے کہا جاتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ ربیع الاول کو اس دنیا سے پردہ فرمایا۔ "نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ وفات 12 ربیع الاول ہے، اگرچہ تاریخ وفات میں کئی دوسرے اقوال بھی نقل کیے گئے ہیں۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت کے بارے میں بھی متعدد اقوال نقل کیے گئے ہیں، جن میں سے مشہور چار قول ہیں۔

2 ربیع الاول۔ 8 ربیع الاول۔ 12 ربیع الاول۔ 15 ربیع الاول۔ (شرح النووی علی الجامع الصحیح لمسلم، کتاب الفضائل، باب قدر عمرہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: 2/260) اب ان چار تاریخوں میں سے دو تاریخوں کو اصحاب سیر نے اختیار کیا ہے، ایک 8 ربیع الاول ہے اور دوسری 12 ربیع الاول ہے، 12 ربیع الاول کی تاریخ کو اصحاب سیر نے محمد بن اسحاق کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

لیکن محمد بن اسحاق رحمہ اللہ کی جو اپنی سیرت کی کتاب ہے، اس میں انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متعین تاریخ ولادت کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔ (دیکھیے: السیرۃ النبویۃ لابن اسحاق، مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: 1/99) جب کہ اکثر اصحاب سیر نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ ولادت کے بارے میں آٹھ ربیع الاول کو اختیار فرمایا ہے۔

چناں چہ علامہ طبری رحمہ اللہ اپنی کتاب "خلاصۃ سیر سید البشر" میں فرماتے ہیں: **ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکۃ عام الفیل . . . في یوم الاثنین في شھر ربیع الاول، قیل: للیلتین خلتا منہ، وقیل لثمان، وصححہ کثیر من العلماء، وقیل: لاثنتی عشرۃ لیلۃ، ولم یذکر ابن اسحاق غیرہ** (خلاصۃ سیر سید البشر للطبری، الفصل الثانی في ذکر میلادہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص: 9)

"شرح الزرقانی" میں ہے: وقد اختلف فی عام ولادته ﷺ، فالأکثرون علی أنه عام الفیل... وکذا اختلف أیضاً فی أیّ یوم من الشهر... وقیل لثمان خلت منه، قال الشیخ قطب الدین القسطلانی: وهو اختیار اکثر اهل الحدیث، ونقل عن ابن عباس وجبیر بن مطعم: وهو اختیار أکثر من له معرفة بهذا الشأن، واختاره الحمیدی، وشیخه، ابن حزم، وحکی القضاعی في "عیون المعارف" اجماع أهل التاریخ علیه، ورواه الزهری عن محمد بن جبیر بن مطعم، وکان عارفا بالنسب وأیام العرب، أخذ ذلک عن أبیه جبیر" (شرح العلامة الزرقانی، قد اختلف فی عام ولادته ﷺ: 1/248-247)

اسی طرح علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے اپنے شیخ امام دمیاطی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے 10 ربیع الاول کے قول کی تصحیح کی ہے۔ فرماتے ہیں: "قال شیخنا ابو محمد الدمیاطی في السیرة من تالیفه عن أبی جعفر محمد بن علي قال: ولد رسول الله ﷺ یوم الأثنین لعشر لیال خلون من ربیع الاول، وکان قدوم أصحاب الفیل قبل ذلک في النصف من المحرم وقال ابو معشر نجیح: ولد لاثنتی عشرة لیلة خلت من ربیع الاول، قال الدمیاطي: والصحیح قول أبي جعفر (السیرة النبویة للذهبی، مولده المبارک ﷺ: 1/7)

متأخرین اصحاب سیر علماء میں سے بھی اکثر حضرات نے آپ ﷺ کی تاریخ ولادت میں 12 ربیع الاول کا قول اختیار نہیں کیا، بلکہ 8 یا 9 ربیع الاول کے قول کو اختیار کیا ہے اور اس کو ترجیح دی ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب "سیرت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" میں لکھتے ہیں: سرور عالم، سید ولد آدم، محمد مصطفی، احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ وصحبہ وبارک وسلم وشرف وکرم واقعہ فیل کے پچاس یا پچپن روز کے بعد بتاریخ 8 ربیع الاول یوم شنبہ مطابق ماہ اپریل 570 عیسوی مکہ مکرمہ میں صبح صادق کے وقت ابوطالب کے مکان میں پیدا ہوئے۔

ولادت باسعادت کی تاریخ میں مشہور قول تو یہ ہے کہ حضور پرنور ﷺ 12 ربیع الاول کو پیدا ہوئے، لیکن جمہور محدثین اور مؤرخین کے نزدیک راجح اور مختار قول یہ ہے کہ حضور ﷺ 8 ربیع الاول کو پیدا ہوئے، ابن عباس اور جبیر بن مطعمؓ سے بھی یہی منقول ہے اور اسی قول کو علامہ قطب الدین قسطلانی نے اختیار کیا ہے۔ (سیرت مصطفی ﷺ، ولادت باسعادت: 1/52)

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: تاریخ ولادت کے متعلق مصر کے مشہور ہیئت دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس میں انہوں نے دلائل ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت 9 ربیع الاول روز دوشنبہ مطابق 20 اپریل 571ء میں ہوئی تھی۔ (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم: 1/126-125) قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری لکھتے ہیں: ہمارے نبی ﷺ موسم بہار میں دوشنبہ (پیر) کے دن 9 ربیع الاول سنہ 1 عام الفیل مطابق 22 اپریل 571ء کے مطابق یکم جیٹھ 628 بکرمی کو مکہ معظمہ میں بعد از صبح صادق وقبل از طلوع نیر عالم تاب پیدا ہوئے۔ (رحمة للعالمین: 1/47)

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمہ اللہ نے "احسن الفتاوی" میں حساب کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

تاریخ ولادت کو ثابت کیا ہے۔حساب کر کے فرماتے ہیں: ولادت مبارکہ بالاتفاق دوشنبہ 2 یا 9 ربیع الاول، مغلطائی نے اول کو ترجیح دی ہے، مگر حضرت عبداللہ بن عباس وجبیر بن مطعم رضی اللہ عنہم سے 8 ربیع الاول منقول ہے اور جمہور محدثین ومؤرخین کا یہی مختار ہے، حسابی قاعدہ میں ایک دن کا فرق معمولی بات ہے۔(احسن الفتاوی:2)

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ ولادت میں پہلے سے مورخین واہل سیر کا اختلاف ہے، دوشنبہ کا دن اور ربیع الاول کا مہینہ تو متفق علیہ ہے، مگر تاریخ کی تعیین میں متعدد اقوال ہیں، کسی نے دوسری، کسی نے تیسری، کسی نے آٹھویں، کسی نے نویں، کسی نے بارہویں تاریخ بتائی ہے۔از روئے حساب جو جانچا گیا تو 9 تاریخ والا قول زیادہ قوی ثابت ہوا، اسی وجہ سے علامہ شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا قاضی محمد سلیمان مرحوم نے اسی قوی اور راجح قول کو اختیار فرمایا ہے، لیکن عوام میں بارہویں تاریخ والے قول کی شہرت زیادہ ہوگئی تھی، اس بنا پر عوام بارہویں ہی کو یوم ولادت سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہے ہیں۔(کفایت المفتی، کتاب العقائد، آٹھواں باب اختلافی مسائل:1/147)

خلاصہ یہ نکلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت کے بارے میں اکثر محقق علماء ومورخین نے 8 یا 9 ربیع الاول کے قول کو اختیار کیا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے، نہ کہ 12 ربیع الاول کے قول کو اور پھر جیسے تاریخ ولادت کے بارے میں 12 ربیع الاول کا قول ہے، اسی طرح تاریخ وفات کے بارے میں بھی 12 ربیع الاول کا قول ہے۔

تو اب ناواقف مسلمانوں کا 12 ربیع الاول کو تاریخ ولادت کے طور پر متعین کر کے اس دن اس انداز سے خوشی منانا، جلوس نکالنا اور سینکڑوں غیر شرعی امور کا ارتکاب کرنا جس کا شریعت میں نام ونشان تک نہیں۔یہ کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اگر مان لیا جائے کہ 12 ربیع الاول ہی تاریخ ولادت ہے اور دوسری جانب یہی دن تاریخ وفات بھی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس دنیا سے پردہ فرما جانا کائنات کا سب سے بڑا غم ہے تو پھر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ 12 ربیع الاول میں صرف اسباب خوشی کو ذہن میں رکھ کر عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منعقد کی جائے، جلوس نکالے جائیں اور وہ جلوس بھی ایسے جن میں سینکڑوں طرح کی خرافات وبدعات پائی جاتی ہوں، جن میں شاہ راہوں، سڑکوں کو بند کر کے لوگوں کو پریشانی میں ڈالنا، ڈھول کی تھاپ پر رقص کرنا اور اپنی ان ساری خرافات کو نہ صرف درست سمجھنا، بلکہ عین دین سمجھنا، بلکہ اگر کوئی مسلمان ان خرافات کا حصہ نہ بنے تو اس پر گستاخ رسول کے طعنے کسے جاتے ہیں اور اس مہینے میں ان ساری خرافات کے ارتکاب پر عشق رسول کا لیبل لگایا جاتا ہے۔

محفل میلاد کی حقیقت اور حکم

اس میں شک وشبہ کی ادنی گنجائش بھی نہیں ہے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ عشق وعقیدت اور محبت عین ایمان ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے لے کر وفات تک زندگی کے ہر شعبہ کے صحیح حالات وواقعات اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وافعال کو پیش کرنا باعث نزول رحمت خداوندی ہے اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حالات معلوم کرے اور ان کو مشعل راہ بنائے، سال کے ہر دن میں کوئی وقت ایسا نہیں جس میں آپ کی زندگی کے حالات

بیان کرنے اور سننے ممنوع ہوں، یہ بات محل نزاع نہیں ہے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا ربیع الاول کی، بارہویں تاریخ کو مقرر کرکے، اس میں میلاد منانا، محفل اور مجلس منعقد کرنا، جلوس نکالنا یا اسی دن کو مخصوص کرکے فقراء اور مساکین کو کھانا کھلانا وغیرہ آپ ﷺ اور حضرات صحابہ کرامؓ اور خیر القرون سے ثابت ہے؟ آپ ﷺ نبوت کے بعد تئیس سال حیات رہے اور پھر تیس سال خلافت راشدہ کے گزرے ہیں اور پھر ایک سو دس ہجری تک حضرات صحابہ کرامؓ کا دور رہا ہے، کم وبیش دو سو بیس برس تک اتباع تابعین کا زمانہ تھا، عشق ان میں کامل تھا، محبت ان میں زیادہ تھی، آپ ﷺ کا احترام اور تعظیم ان سے بڑھ کر کون کرسکتا ہے؟ تو کیا آج کا ناواقف مسلمان عشق رسول کے نام پر اس مہینے میں میلاد وغیرہ جن امور کا ارتکاب کر رہا ہے کیا وہ خیر القرون سے اس کو ثابت کرسکتا ہے؟ نہیں کرسکتا اور نہ قیامت تک کرسکے گا، اگر یہ ثواب کے کام ہوتے تو پھر یہ کام خیر القرون میں کیوں نہیں ہوئے؟

محفل میلاد کا تاریخی پس منظر:

ربیع الاول کے مہینے میں جاہل مسلمانوں کا میلاد کے نام پر خرافات کا ارتکاب کرنا، اس کی آخر ابتدا کہاں سے ہوئی؟ عجیب بات ہے کہ جن خرافات کو آج دین سمجھا جارہا ہے، جس کی اہمیت نماز، روزے سے بھی زیادہ سمجھی جاتی ہے ان خرافات کی ابتدا کو اگر تلاش کیا جائے تو چھ صدیوں تک تو ان خرافات کا مسلمانوں میں رواج نہ تھا، چھٹی صدی، ہجری میں ایک بادشاہ گزرے ہیں جن کا نام مظفر الدین تھا، اور ان کی دینی حالت کے بارے میں آتا ہے:

"كان ملكا مسرفا يأمر علماء زمانه أنه يعملوا باستنباطهم و اجتهادهم و أن لا يتبعوا لمذهب غيرهم حتى مالت إليه جماعة من العلماء و طائفة من الفضلاء و احتفل لمولد النبي ﷺ في ربيع الاول، وهو من احدث من الملوك هذا العمل (القول المعتمد في عمل المولد) "وہ ایک مسرف بادشاہ تھا، علماء زمانہ سے کہا کرتا تھا کہ وہ اپنے استنباط او راجتہاد پر عمل کریں اور غیر کے مذہب کی پیروی نہ کریں۔ حتی کہ (دنیا پرست) علماء اور فضلا کی ایک جماعت اس کی طرف مائل ہوگئی اور وہ ربیع الاول میں میلاد منعقد کیا کرتا تھا، بادشاہوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ بدعت گھڑی ہے۔"

"وفیات الأعیان" میں ابن خلکان رحمہ اللہ نے مظفر الدین بادشاہ کے ربیع الاول میں میلاد منعقد کرنے کی پوری تفصیل ذکر فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

"وأما احتفاله بمولد النبي ﷺ ... وهو أن أهل البلاد كانوا قد سمعوا بحسن اعتقاده فيه، فكان في كل سنة يصل إليه من البلاد القريبة من إربل ... ولا يزالون يتواصلون من المحرم إلى أوائل شهر ربيع الاول ويتقدم مظفر الدين بنصب قباب من الخشب ... فإذا كان أول صفر زينوا تلك القباب بأنواع الزينة الفاخرة المستجملة، وقعد في كل قبة جوق من المغاني وجوق من أرباب الخيال ومن أصحاب الملاهي ... فكان مظفر الدين ينزل كل يوم بعد صلاة العصر ويقف على قبة قبة إلى أخرها، ويسمع غناءهم ويتفرج على خيالاتهم يما يفعلونه في القباب ... هكذا

يعمل كل يوم إلىٰ ليلة المولد و كان يعمله سنة في ثامن الشهر، و سنة في الثانى عشر لأجل الاختلاف الذى فيه، فإذا كان قبل المولد بيومين أخرج من الإبل و البقر و الغنم شيئاً كثيراً زائداً عن الوصف وزفها بجميع ماعنده من الطبول والمغانى والملاهى حتى يأتى بها إلى الميدان، ثم يشرعون في نحرهم، وينصبون القدور ويطبخون الألوان المختلفة، فإذا كانت ليلة المولد عمل السماعات بعد أن يصلى المغرب في القلعة، ثم ينزل وبين يديه من الشموع المشتعلة شيء كثير . . . "(وفيات الأعيان، رقم الترجمة:547، مظفر الدين صاحب إربل:4/118-117)

معلوم ہوا کہ ربیع الاول میں عید میلاد النبی کے نام پر جو ناچ گانا، جلوس، چراغاں، طرح طرح کے کھانوں کا اہتمام جو عشق رسول اور دین کے نام پر کیا جاتا ہے اس کی اصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، فقہاء ومحدثین سے نہیں، بلکہ یہ چھٹی صدی کے ایک بادشاہ کا طریقہ ہے۔ اور اس مظفر الدین بادشاہ کے لیے جس دنیا پرست مولوی نے محفل میلاد کے جواز پر مواد اکٹھا کر دیا تھا اس کا نام عمر بن دحیہ تھا۔ اس عمر بن دحیہ کے بارے میں "لسان المیزان" میں ہے: قال الحافظ الضياء: لم يعجبنى حاله، كان كثير الوقيعة في الأئمة یہ ائمہ دین کی شان میں بہت گستاخی کیا کرتا تھا۔ "لسان المیزان" میں ان کے بارے میں ایک اور جگہ ہے: "قال ابن النجار: رأيت الناس مجمعين على كذبه وضعفه۔(6/86)۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: "كان كثير الوقيعة في الأئمة وفي السلف من العلماء، خبيث اللسان أحمق، شديد الكبر، قليل النظر في أمور الدين، متهاونا"(لسان الميزان:6/850، وكذا في سير أعلام النبلاء، رقم الترجمة:248، ابن دحية:22/395-394) یعنی یہ ائمہ دین اور علماء کی شان میں بہت گستاخی کرتا تھا، گندی زبان کا مالک تھا، بڑا احمق اور متکبر تھا، دین کے کاموں میں بڑا بے پروا اور سست تھا۔ اب ان خرافات میں مبتلا ہر مسلمان کے لیے سوچنے کا مقام ہے کہ اس کے لیے دین کے معاملے میں اور جس کام کو وہ ثواب سمجھ کر کر رہا ہے اس میں اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، خیر القرون کا اتباع ضروری ہے یا ایک نفس پرست بادشاہ اور زر پرست مولوی کی اتباع کرنا ضروری ہے؟! مروجہ طریق پر محفل میلاد کی فقہاء نے سختی سے تردید فرمائی ہے۔

"ابن الحاج المالکی رحمہ اللہ" نے اپنی کتاب "المدخل" میں کئی صفحات میں اس مروجہ محفل میلاد کی تردید فرمائی ہے اور اس کے مفاسد شمار فرمائے ہیں۔ شروع میں فرماتے ہیں: "ومن جملة ما أحدثوه من البدع مع اعتقادهم أن ذلك من أكبر العبادات وإظهار الشعائر ما يفلعونه فى شهر ربيع الأول من المولد وقد احتوى على بدع ومحرمات جملة" (لوگوں کو ان بدعتوں میں سے جن کو وہ بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور جن کے کرنے کو وہ شعائر اسلامیہ کا اظہار سمجھتے ہیں وہ مجلس میلاد ہے جس کو وہ ماہ ربیع الاول میں کیا کرتے ہیں، یہ مجلس بہت سی بدعات اور محرمات پر مشتمل ہوتی ہے۔ (المدخل، فصل في المولد:2/2) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت پر عمل کرنا ہی اصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا حقیقی تقاضا ہے۔، چناں چہ زندگی کا جو رخ بھی ہو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو اختیار کیا جائے۔

عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

اہمیت- آداب- تقاضے

مولانا سفیان علی فاروقی

آج کل ہم سب کا دعویٰ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اتنا سچا عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ اس سے بڑھ کر اور اس سے زیادہ عاشقِ رسول دنیا میں کوئی بھی نہیں، لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہماری زندگی کا ۸۰ رفیصد حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور احکامات کی پیروی سے یکسر خالی ہے (اور یہ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی انوکھی قسم ہے)۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن ہم نے پنج وقتہ نماز نہیں پڑھنی۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن ہم نے اپنی شادیاں ہندوانہ رسم ورواج اور انگریزوں کی پیروی کرتے ہوئے کرنی ہیں۔

ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن ہمارے غمگین لمحات اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی پر گزرتے ہیں۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن ہماری معاشرتی زندگی سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوسوں دور ہے۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن ہمارا کاروبار احکاماتِ نبوی سے یکسر مختلف ہے۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن ہمارے بچوں کا آئیڈیل انگریز ہے۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن زندگی یورپ کی جینا چاہتے ہیں۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن والدین، بہن بھائیوں، عزیز و اقارب کے حقوق کے معاملے میں نبوی احکامات کے بالکل خلاف چل رہے ہیں۔ ہم عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، لیکن ہماری عملی زندگی میں سیرت کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ سو عشق کا دعویٰ کرنا اور سچا عاشق بننا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں اور حقیقتاً ہم عشق کے دعویدار تو ہیں، لیکن سچے عاشق نہیں ہیں۔

عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اہمیت

ایک مسلمان اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک اس کا عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کامل نہ ہو، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر ادا، ہر ہر قول اور ہر ہر عمل سے سچا عشق نہ ہو، زندگی کے ہر معاملے میں سب سے پہلے نبوی طرزِ عمل کو ڈھونڈے، جی جان سے اس پر عمل کی کوشش کرے، احکاماتِ نبوی کے مطابق زندگی کے شب و روز گزارنے کی جدوجہد کرے، اپنے معاملات، معاشرت، لین دین، خوشی وغمی ہر چیز احکاماتِ نبوی کے تابع کردے، یہی ہر مسلمان سے تقاضا ہے، یہی اس کی زندگی کا منہج ومقصد ہے، اسی چیز پر زندگی گزارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ربانی ہے کہ:

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا" (سورۃ الاحزاب) "کسی مؤمن مرد اور عورت کو یہ

حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملے میں اختیار باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ و رسول ﷺ کی نافرمانی کرے، وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔''

سورۃ الحشر میں ارشادِ الٰہی ہے: ''وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ'' (الحشر: ۷) ''جو کچھ رسول تمہیں دیں، وہ لے لو اور جس چیز سے تمہیں روک دیں، اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، وہ شدید عذاب دینے والا ہے۔''

آپ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ''لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ۔'' (مشکوٰۃ) ''تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی خواہشات کو میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ کر دے۔''

عشقِ رسول (ﷺ) کے آداب

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں، وہ عشق ہی کیا جس میں ادب و آداب کا لحاظ نہ ہو۔ تاریخ کی کتابوں میں ایک مشہور واقعہ درج ہے: بادشاہ ناصر الدین محمود کے ایک خاص مصاحب کا نام محمد تھا، بادشاہ اس کو اسی نام سے پکارا کرتا تھا، ایک دن خلافِ معمول اسے ''تاج الدین'' کہہ کر آواز دی، وہ تعمیلِ حکم میں حاضر تو ہو گیا، لیکن بعد میں گھر جا کر تین دن تک نہیں آیا، بادشاہ نے بلوایا اور تین روز تک غائب رہنے کی وجہ دریافت، کی تو اس نے کہا: آپ ہمیشہ مجھے ''محمد'' کے نام سے پکارا کرتے تھے، لیکن اس دن آپ نے ''تاج الدین'' کہہ کر پکارا، میں سمجھا میرے متعلق آپ کے دل میں کوئی خلش پیدا ہو گئی ہے، اس لیے تین دن تک حاضرِ خدمت نہیں ہوا، ناصر الدین نے کہا: ''واللہ! میرے دل میں آپ کے متعلق کسی قسم کی کوئی خلش نہیں، تاج الدین کے نام سے تو میں نے اس لیے پکارا تھا کہ اس دن میرا وضو نہیں تھا اور مجھے ''محمد'' کا مقدس نام بغیر وضو کے لینا مناسب معلوم نہیں ہوا۔''

اسی طرح ہمارے محدثین کا الحمد للہ معمول رہا ہے کہ جب بھی کوئی حدیث نقل کرنے لگتے ہیں تو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ آداب کے ساتھ باوضو ہو کر حدیث کو نقل کرتے ہیں، ہم نے اپنے بڑوں کو دیکھا ہے کہ وہ کسی ایسی بات کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرتے جس کے متعلق انہیں علم نہ ہو کہ واقعی آپ ﷺ نے ہی فرمائی ہے، کیونکہ کوئی بھی ایسی بات جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمائی ہو اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا انتہا درجے کی بے ادبی ہے، یہ بھی انتہا درجے کی بے ادبی ہے کہ کسی ایسے شخص کو گستاخِ رسول قرار دے جس نے گستاخی نہ کی ہو۔

یہ بھی انتہا درجے کی بے ادبی ہے کہ آپ ﷺ کا نام نامی آئے اور ہم درود و سلام نہ پڑھیں، یہ بھی بے ادبی ہے کہ ایک معاملے میں نبی کریم ﷺ کا طرزِ عمل موجود ہو اور ہم اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا طرزِ عمل اختیار کریں۔ ادب یہ ہے کہ اپنی سوچ، فکر، فہم، رسم و رواج سب کچھ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے تابع کر لیں، ساری محبتیں اس ایک محبت پر قربان کر دیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دنیا کی تمام چیزوں کی محبت کو رسول اللہ ﷺ کی محبت پر قربان کر دیا تھا، آپ ﷺ کی محبت میں ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار قربان کر دیے، غرضیکہ سب کچھ قربان کر دیا، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن کو نہ چھوڑا۔

سیدنا ابوسفیان رضی اللہ عنہ حالت کفر میں اپنی بیٹی کو ملنے کے لیے آتے ہیں اور کملی والےؐ کے مقدس بستر پر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں تو بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا یکدم بولتی ہے: ''ابا جان! ذرا ٹھہریئے'' باپ رُک گیا۔ بیٹی کیا بات ہے؟ بیٹی نے جلدی سے بستر لپیٹ دیا، سیدنا ابوسفیانؓ بولے: کیا یہ بستر میری شان کے لائق نہیں؟ یا میں اس بستر پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہوں؟ بیٹی نے کہا: یہ ''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاک بستر ہے اور آپ اس وقت ناپاک ہیں۔'' ذرا اندازہ لگایئے کہ سیّدہ ام حبیبہؓ نے اپنے باپ کی ذرا پرواہ نہیں کی اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنے باپ کو بھی رد کر دیا۔

عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تقاضے

عاشق کے وجود کا ظاہری حلیہ اور اس کے اعمال میں جھلکتا باطنی عشق اس کے عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہو، اسے اپنے عشق کے اظہار کے لیے عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کے نعرے نہ لگانے پڑیں، بلکہ اس کے اعمال چیخ چیخ کر دنیا کو بتادیں کہ یہ ہے سچا عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحابہ کرامؓ نے یہی کیا تھا۔

آیئے! ان کے عشق کی چند جھلکیاں دیکھتے ہیں: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عشق کی چند جھلکیاں:

۱- موسیٰ بن عقبہؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سالم بن عبداللہ بن عمرؒ کو دیکھا کہ وہ دورانِ سفر راستے میں بعض مقامات تلاش کرتے تھے اور وہاں نماز پڑھتے تھے، کیونکہ انہوں نے اپنے والد عبداللہؓ کو اور انہوں نے اپنے والد عمرؓ کو وہاں نماز پڑھتے دیکھا تھا اور حضرت عمر وہاں اس لیے نماز پڑھتے تھے کہ انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہاں نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ (بخاری: ۴۸۳)

۲- حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سواری پر سوار ہوئے تو دعائے مسنون پڑھنے کے بعد مسکرانے لگے۔ کسی نے پوچھا: امیر المومنین! مسکرانے کی کیا وجہ ہے؟ آپؓ نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سواری پر سوار ہو کر اسی طرح دعا پڑھی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے تھے، لہٰذا میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں مسکرایا ہوں۔ (ابوداود؛ ۲۶۰۲)

۳- حضرت انس رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کدو پسند ہیں، تو وہ بھی کدو پسند کرنے لگے۔ (مسند احمد: ۳/ ۱۷۷) ۴- ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکہ کے بارے میں فرمایا کہ: سرکہ تو اچھا سالن ہے تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تب سے مجھے سرکے سے محبت ہوگئی ہے۔ (دارمی: ۲۱۸۱)

۴- ایک بار ایک صحابیؓ کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ہاتھ سے اُتار کر دور پھینک دی، گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اظہارِ ناراضگی کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لے جانے پر کسی نے کہا کہ اس کو اُٹھالو اور بیچ کر فائدہ حاصل کرلو (کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف پہننے سے منع فرمایا تھا) مگر اس نے کہا: خدا کی قسم! میں اسے کبھی نہیں اٹھاؤں گا، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھینک دیا ہے۔ (مسلم: ۲۰۹۰)

۵- کچھ صحابہؓ کو بیعت کی شرائط میں یہ نصیحت بھی فرمائی کہ: ''لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرنا'' تو انہوں نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ اگر اونٹنی پر سوار کہیں جا رہے ہوتے اور ہاتھ سے لگام گر جاتی تو اونٹنی کو بٹھا کر خود اپنے ہاتھ سے اس کو اٹھاتے تھے اور کسی آنے جانے والے سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا کر دے دو۔ (مسند احمد: ۵/ ۲۷۷)

۶- سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن مرادِ رسول سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے پوچھتے ہیں: ''اے عمرؓ! تم میرے ساتھ کتنا عشق و پیار کرتے ہو؟'' فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا: ''اپنے ماں باپ سے، اپنی اولاد سے، اپنے رشتہ داروں سے، اپنے دوستوں سے، بلکہ کل کائنات سے زیادہ آپ سے عشق رکھتا ہوں اور عزیز سمجھتا ہوں بجز اپنی جان کے۔'' کملی والے آقا ﷺ نے فرمایا: ''اے عمرؓ! اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں مجھ محمدؐ کی جان ہے اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز نہ سمجھے۔'' فاروقِ اعظمؓ نے کہا: ''اب آپؐ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عمرؓ! اب تو مومن ہے۔

صحابہ کرامؓ کا معاملہ بھی عجیب تھا، ان کی محبت کا دارومدار بس عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا، اگر کوئی آپ ﷺ پر ایمان نہیں لایا تو پھر خونی رشتے بھی بے معنی تھے اور اگر کوئی ایمان لایا اور خونی رشتہ نہیں بھی تھا تو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔ واقعی تاریخ انسانیت میں ایسا انقلاب نہ پہلے آیا اور نہ کبھی آئے گا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کر دیا۔ حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبیدہ بن حارثؓ نے اپنے قریبی رشتہ داروں عتبہ، شیبہ، ولید وغیرہ کو قتل کیا۔ غرضیکہ صحابہ کرامؓ نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں اپنے ماں، باپ، بہن، بھائی، عزیز و اقارب سب کو قربان کر دیا، اسی لیے ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ترجمہ: ''جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، آپ ان کو نہ دیکھیں گے کہ ایسے شخصوں سے دوستی رکھتے ہوں جو اللہ اور رسول کے برخلاف ہیں، چاہے وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبہ ہی کیوں نہ ہو، ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان ثبت کر دیا ہے۔'' (المجادلہ: ۲۲)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنا سب کچھ نبی کریم ﷺ پر لٹا دیا تو پھر اللہ پاک نے بھی اپنی تمام نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیئے، ان کے قدموں میں سلطنتیں تسبیح کے دانوں کی طرح گریں، دنیا کے خزانے مدینہ کی گلیوں بکھرنے لگے، دنیا کی قیادت و سعادت ان پر فخر کرنے لگی، ان کے احکامات پھر چرند، پرند، ابحار، اشجار سبھی نے مانے اور جب تک مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پر عمل پیرا رہے، عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حرزِ جاں بناتے رہے، اس وقت تک ساری دنیا ان کے در کی دریوزہ گر رہی اور جیسے ہی انہوں نے عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے منہ موڑا، اللہ پاک کی تمام نعمتوں نے مسلمانوں سے منہ موڑ لیا۔

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ہمارا طرزِ عمل

مولانا نازاہد مکھیالوی

سید الکونین خاتم الانبیا حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لے کر وفات تک، بچپن، جوانی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑھاپا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت، آپ کی معاشرت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقائد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رہن سہن غرض یہ کہ زندگی کے ہر موڑ اور ہر گوشہ کا نام سیرت ہے۔ عقل وفہم اور دینی شعور رکھنے والے کسی بھی مسلمان پر یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ انسانی زندگی کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عالی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' [الاحزاب: ۲۱] (اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔)

نیز امتِ مسلمہ کے لیے آپ کی بے پایاں شفقت ومہربانی اور مسلمانوں کی خیر وفلاح کے لیے قلبی تڑپ اور جہد مسلسل کے وقیع مضامین سے قرآن وحدیث بھرے ہوئے ہیں، چناں چہ قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد باری ہے:

''لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ'' [التوبہ: ۱۲۸] (تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول تشریف لائے ہیں، ان پر تمہاری تکلیف بھاری ہے اور وہ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں اور ایمان والوں پر نہایت شفیق ومہربان ہیں۔)

اسی شفقت ومہربانی کے تعلق سے ایک حدیث ملاحظہ فرمائیں:

''أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم تلا قول اللہ تعالی فی إبراھیم: ﴿رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيْراً مِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهُ مِنِّيْ﴾ وقال عیسی علیہ السلام: ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ﴾ فرفع یدیہ وقال اللھم أمتی أمتی وبکی۔ فقال اللہ تعالی: یا جبریل! اذھب إلی محمد وربک أعلم ،فَسَلْه ما یبکیک؟ فأتاہ جبریل۔علیہ الصلاۃ والسلام۔ فسألہ فأخبرہ رسول اللہ۔ ﷺ۔ بما قال وھو أعلم فقال اللہ: یا جبریل اذھب إلی محمد فقل: إنا سنرضیک فی أمتک ولا نسوؤک'' (رواہ مسلم: (۱/۱۱۳))

(حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ آیت تلاوت فرمائی: [کہ میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گم راہ کر دیا یعنی ان کی وجہ سے بہت سے آدمی گم راہ ہو گئے، پس جو لوگ میری پیروی کریں وہی میرے ہیں، پس ان کے لیے تو میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ ان کو تو ہی بخش دے)۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا: [اے اللہ! اگر آپ میری امت کے ان لوگوں کو عذاب دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں] (یعنی آپ کو عذاب وسزا کا پورا حق ہے) پھر آپ صلی اللہ علیہ

وسلم نے دعا کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کیا اور کہا اے میرے اللہ! میری امت، میری امت۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دعا میں روئے، اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو فرمایا کہ محمد کے پاس جاؤ؛ اگرچہ تمہارا رب سب کچھ خوب جانتا ہے؛ مگر پھر بھی تم جا کر ہماری طرف سے پوچھو کہ ان کے رونے کا سبب کیا ہے؟ پس جبرئیل علیہ السلام آپ کے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام وہ بتلایا، جو اللہ سے عرض کیا تھا یعنی اس وقت میرے رونے کا سبب امت کی فکر ہے۔ جبرئیل علیہ السلام نے جا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تو اللہ نے جبرئیل علیہ السلام کو فرمایا کہ محمد کے پاس جاؤ اور ان کو ہماری طرف سے کہو کہ تمہاری امت کے بارے میں ہم تمہیں راضی اور خوش کر دیں گے اور تمہیں رنجیدہ اور غمگین نہیں کریں گے۔)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِعَائِشَۃَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِھَا وَ مَا اَسْرَرَتْ وَ مَا اَعْلَنَتْ" یہ دعا سن کر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا یہاں تک ہنسیں کہ ان کا سر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود کی طرف جھک گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تجھ کو میری دعا نے خوش کر دیا؟ عرض کیا حضرت! آپ کی دعا کیوں خوش نہ کرتی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدا کی قسم! یہی میری دعا میری تمام امت کے لیے ہر نماز کے بعد ہوتی ہے۔ (مجمع الزوائد ج9/244)

یہ امت کے فکر وغم اور خیر خواہی کے جذبات سے معمور پیغمبرانہ مزاج تھا جو ہمہ وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مضطرب و بے چین رکھتا تھا اور یہ سلسلہ شفقت و مہربانی صرف دنیا کی فانی زندگی تک محدود نہیں بلکہ محشر کے میدان میں بھی، جب ہر انسان ہی نہیں بلکہ ہر نبی نفسی نفسی کے عالم میں ہوگا، کرب وابتلا کے عین موقع پر بھی زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر امتی امتی جاری ہوگا اور آپ دیگر انسانوں کے ساتھ ساتھ اپنی امت کے حق میں خصوصی شفاعت فرمائیں گے۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو امت سے اس قدر محبت و پیار کا تعلق اور ہم مسلمانوں کا سنتِ نبوی سے اعراض یقینا انتہائی تشویش ناک اور تکلیف دہ ہے، اللہ تعالیٰ ہی ہمارے حال پر رحم فرمائے، جس نبی کو اسوہ بنا کر مبعوث کیا گیا، اس نبیِ رحمت نے زندگی کے کسی بھی گوشہ کو تشنہ نہیں چھوڑا؛ بلکہ کامل ومکمل طریقہ سے تمام شعبوں میں زبانی، عملی ہر طرح سے اور ہر سطح سے رہبری فرمائی۔ خواہ ان اُمور کا تعلق عبادت سے ہو یا معاملات سے یا معاشرت واخلاقیات سے، زندگی کا ہر مرحلہ اس آفتابِ نبوت کی پاکیزہ ومقدس روشنی سے منور اور روشن ہے۔

ہماری سب سے بڑی کوتاہی یہ ہے کہ ہم بے عملی کا شکار ہیں، رذیل دنیا کی حرص وطمع کے دبیز پردوں نے ہمیں پوری طرح سے ڈھانپ رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ منزل کی صحیح سَمت معلوم ہونے کے باوجود ہم اس پر چلنے سے عاجز وقاصر رہتے ہیں، شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا محاسبہ خود کریں، اپنی عبادتوں کا جائزہ لیں، ہماری نمازیں پیغمبر کی نماز سے میل کھاتی ہیں یا نہیں؟ زکوٰۃ اور رمضان شریف کے روزوں، حج بیت اللہ اور دیگر عبادتی کاموں میں ہم اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو کتنا ملحوظ رکھتے ہیں؟ اسی طرح معاملات کو دیکھیں کہ اس میں ہم کس حد تک پیغمبرانہ اسوہ کو اختیار

کیے ہوئے ہیں یا غیروں کے بنائے ہوئے اُصول اور ان کے بے برکت طریقے اختیار کرتے ہیں، معاملات کی صفائی و شفافیت کے متعلق نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات پر ہمیں کتنا اعتماد ہے، اخلاق ومعاشرت کے پہلو سے بھی ہم اپنے طرزِ عمل پر نظر ڈالیں، اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری خصلتیں اور مزاج کتنا متاثر ہے۔

حرص وطمع، کینہ وحسد، حبِ جاہ، حبِ مال، عجب وریا، کذب وخیانت، غرور وگھمنڈ، غصہ اور بخل جیسی خسیس اور گھٹیا عادتوں سے ہم عملی طور پر کتنی نفرت کرتے ہیں اور اخلاقِ عالیہ تواضع وانکساری توبہ واستغفار، انس ومحبت، زہد وتوکل، صبر وشکر، حلم وبردباری، صدق واخلاص، احسان ورضا، شرم وحیا، ہمدردی ورحم دلی، جیسے بلند اوصاف سے ہماری طبیعت کتنی مانوس ہے اور وقت آنے پر ان دو متضاد راہوں میں سے ہم کس راہ کو اختیار کرتے ہیں۔

اسی طرح اپنی معاشرتی زندگی کا بھی جائزہ لیں اور بہت سنجیدگی سے محاسبہ کریں کہ قبیلہ وخاندان اعزاء واقرباء پڑوسیوں اور دیگر لوگوں کے ساتھ رہن سہن اور گزر بسر کے، سب طریقے ہمارے اچھے ہیں؟ اپنی بستی ومحلہ اور گھروں میں محبت وموانست کی فضا ہے یا نفرت وبیزاری کا ماحول ہے؟ خوش مزاجی، بڑوں کی عزت وعظمت، چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت، ماتحتوں کے ساتھ حسنِ سلوک ورواداری، لوگوں کی خطا ولغزش معاف کرنا، کمزوروں کی مدد کرنا، مہمانوں کی ضیافت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، مظلوموں کی مدد اور ہر شخص کے ساتھ محبت وشفقت کا معاملہ کرنے میں ہماری زندگی کا کتنا حصہ گزرا کہ جس کی بنیاد پر معاشرہ میں آدمی ایک محترم اور بلند کردار انسان کہلانے کا حق دار ہوجاتا ہے، یہ بلند کرداری غیروں میں بھی اس کو باعزت مقام دیتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہم اپنا بھی محاسبہ کریں اور اپنے اہل وعیال کا بھی جائزہ لیں، آج ہمارے بچوں کو موبائل فون، ٹیلی ویژن وغیرہ کے ذریعہ کرکٹ کھیل کی معلومات، کھلاڑیوں کے نام اور مختلف صوبوں، ملکوں میں کھیلے گئے میچوں کا ریکارڈ، فلموں کی اسٹوریاں وغیرہ خوب یاد رہتی ہیں۔ اگر یاد نہیں تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حالات اور ان کی سیرت یاد نہیں، اس میں یقیناً بنیادی طور پر قصور ہمارا ہے۔ ہمیں خود سیرتِ طیبہ کا پتہ نہیں، اس سے یکسر غفلت ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کے نہ تو احوال ہمیں یاد ہیں اور نہ جاننے کی فکر ہے؛ البتہ زبانی محبت کا دعویٰ خوب ہوتا ہے، سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعوذ باللہ کوئی خبیث النفس شرارت کردے تو ہمارا خون کھولنے لگتا ہے، ضرور کھولنا چاہیے اور اس پر جتنا بھی غصہ آئے کم ہے۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ ہم نے خود کیا تعلق قائم کر رکھا ہے۔ ہماری زندگی سنتوں سے کس قدر معمور ہے، ہمیں اس کا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے، ہمارے بچوں کے اندر نبی علیہ السلام کی سیرت کا کتنا چرچا ہوتا ہے، ہمارے گھروں میں سنتیں کتنی زندہ ہیں؟ اس کا سہل ومجرب طریقہ یہ ہے کہ صبح بیدار ہونے سے سونے تک روزمرہ کی دعائیں یاد کی جائیں، بچوں کو بھی یاد کرائیں، اس موضوع کی اُردو، ہندی مختلف (مقامی) زبانوں میں کتابیں بازار میں ملتی ہیں، ان کو ہم پڑھیں، اپنے اہل وعیال میں سنائیں، اسی سے ایک ماحول بنے گا اور سنتوں پر عمل کا داعیہ پیدا ہوگا، ان شاء اللہ ہماری سیرت وصورت، عادات واخلاق سنتوں کے پاکیزہ رنگ میں رنگین ہوجائیں گے۔

باہمی اختلاف اور ملت کی ذمہ داری

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو ایک جیتا جاگتا، ہنستا، بولتا اور چلتا پھرتا وجود عطا کیا ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی ہے، غور وفکر کا ملکہ ودیعت فرمایا ہے اور ارادہ واختیار کی قوت سے اسے نوازا گیا ہے، اس لیے کسی بھی انسانی سماج سے یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اس میں اختلاف پیدا ہی نہ ہو اور وہ پتھر کی مورت کی طرح خاموش اور بے زبان رہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سوچنے کے انداز میں فرق رکھا ہے، ذوق ونظر کا اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور مفادات میں ٹکراؤ بھی، پس کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف کا وقوع پذیر ہونا فطری بات ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں۔

اگر یہ اختلاف خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ ہو بلکہ ضد اور خود غرضی کی وجہ سے ہو، تو یہ مہذب اور شائستہ اختلافِ رائے کی حدود سے گزر کر باہمی جنگ وجدال، تہمت اندازیوں اور الزام تراشیوں کا باعث بن جاتا ہے، معاشرہ میں ہمیشہ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ ایسی نزاع اور اختلاف کا حل کیا ہے؟ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے، جو زندگی کے ہر گوشہ میں انسان کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے، اس نے یقیناً اس سلسلہ میں بھی راہ نمائی کی ہے، کسی بھی نزاع سے بنیادی طور پر تین طبقے متعلق ہوتے ہیں، دو فریق تو وہ جو باہم ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں اور تیسرا وہ سماج اور معاشرہ، جس میں اس طرح کی نزاع پیش آتی ہو، قرآن حکیم کی نگاہ میں فریقین کی ذمہ داری یہ ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں دونوں ایک دوسرے سے قریب آنے کو تیار نہ ہوں اور وہ اپنے طور پر اس فاصلہ کو سمیٹنے اور اس خلیج کو پاٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہوں تو کسی ایک متفق علیہ شخصیت کو فیصل بنالیں یا دونوں فریق اپنی صف سے کسی مخلص، دین دار، سمجھ دار اور معاملہ فہم آدمی کا انتخاب کریں اور ان کو اپنا "حکم" مان لیں، ان دونوں کے حکم کا فریضہ ہے کہ وہ ان دونوں فریق کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی بھرپور سعی کریں، قرآن مجید کہتا ہے کہ اگر حکم طرف دار بنے بغیر نیک نیتی اور صدق دلی کے ساتھ صلح کی کوشش کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کو کامیابی سے ہم کنار فرمائیں گے: ﴿إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا﴾ (النساء:35)

صلح اور باہمی اختلاف کو دور کرنے کا یہ نہایت بہترین طریقہ ہے، بلکہ یہ اختلافات سے باہر آنے کا باعزت راستہ بھی ہے، اس لیے کہ اس میں نہ کسی فریق کی فتح ہے اور نہ کسی فریق کی شکست، اس سے سماج میں بھی انسان کی عزت میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا وخوش نودی کی جو دولت حاصل ہوتی ہے، وہ ان سب سے بڑھ کر ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو حقیر نہ سمجھے، اس کے اندر حقائق کو قبول کرنے کی جرات ہو اور اس کی نگاہ نوشتہ دیوار کو پڑھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔

تیسرا طبقہ جو مسلمانوں کے باہمی اختلاف سے اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکتا، وہ ہمارا سماج ہے، یہ سمجھنا کہ یہ فلاں اور فلاں شخص کا اختلاف ہے، ہمیں اس میں پڑنے کی کیا ضرورت؟! صحیح فکر اور مثبت سوچ نہیں، مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ جب وہ دو افراد کے درمیان آویزش اور اختلاف محسوس کریں تو ان میں صلح کرانے اور شکستہ دلوں کو جوڑنے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، لہٰذا اپنے دو بھائیوں کے درمیان میل ملاپ کرادیا کرو:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (الحجرات:10)

یہ نہایت ہی اہم فریضہ ہے، افسوس کہ مسلمانوں کو اس کی اہمیت اور سماج کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا نہ ادارک ہے اور نہ احساس۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا میں تم کو روزہ، صدقہ اور زکوٰۃ سے بھی افضل چیز بتاؤں؟ ہم لوگوں نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ہے باہمی خلش کو دور کرنا اور صلح کرانا، اصلاحِ ذات البین، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپس میں تعلقات کا بگاڑ مونڈ دینے والی چیز ہے۔ (الادب المفرد، حدیث نمبر:391)۔ "مونڈ دینے والی چیز" سے مراد یہ ہے کہ یہ چیز صفایا کردینے اور تباہ برباد کردینے والی ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے اور ان کے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کا کس قدر پاس ولحاظ تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ نماز میں جماعت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حد درجہ اہتمام تھا، عین میدان جنگ میں بھی غیر معمولی حالات کے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت نہیں چھوٹتی تھی اور مرض وفات میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت میں شرکت کا اہتمام فرمایا، جب خود چلنے کی طاقت باقی نہیں رہی، تب بھی رفقاء کی مدد سے شریک جماعت ہونے کی کوشش فرمائی۔

لیکن اس کے باوجود قبیلۂ بنی عمرو بن عوف میں ایک جھگڑا رفع کرنے اور مصالحت کرانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقا کے ساتھ بہ نفس نفیس تشریف لے گئے اور اس فریضۂ مصالحت میں اتنی تاخیر ہوگئی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت کے لیے آگے بڑھادیا، نماز شروع ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ (بخاری شریف:269) اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ میں مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی کیا اہمیت تھی۔

مدینہ منورہ میں انصار کے دو مشہور خاندان اوس اور خزرج آباد تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے یہ ہمیشہ باہم دست وگریباں رہتے تھے، اسلام ان کے لیے ابر رحمت بن کر آیا، صدیوں سے عداوت کی جو آگ بجھائے نہ بجھتی تھی، وہ لمحوں میں سرد ہوکر رہ گئی اور دونوں قبیلے اُخوتِ اسلامی کے رشتہ سے شیر وشکر ہوکر رہنے لگے۔

یہودیوں کو ان قبائل کا اتحاد اور آپسی محبت ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک بار ایک سن رسیدہ یہودی اُوس وخزرج کے

لوگوں کے پاس سے گزرا اور ان کی باہمی محبت کو دیکھ کر بڑا رنجیدہ ہوا، چناں چہ اس نے اوس وخزرج کی لڑائی کے پرانے قصے چھیڑ دیے اور اس زمانے میں دونوں قبیلے کے شعراء نے ایک دوسرے کے خلاف جو اشعار کہے تھے، ان کا بھی ذکر نکالا، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں خاندانوں کے نوجوان اُٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی جاہلی حمیت لوٹ آئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے ہی اس کی اطلاع ملی، بہت تیز تیز تشریف لائے، لوگوں کو شیطان کی اس وسوسہ اندازی سے باخبر کیا۔

اسی موقع سے سورۂ آل عمران کی یہ آیتیں نازل ہوئیں: "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم پر اسلام ہی کی حالت میں موت آنی چاہیے، سب مل کر اللہ کی رسی کو تھام لو، پھوٹ نہ پیدا کرو اور اپنے اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم آپس میں دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اللہ کے کرم سے بھائی بھائی بن گئے، نیز تم دوزخ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے نکالا، اللہ تعالیٰ اسی طرح تم لوگوں کو احکام بتاتے رہتے ہیں، تاکہ تم ہدایت پر قائم رہو۔" (آل عمران:103-102)

زبانِ مبارک سے ان آیتوں کا سننا تھا کہ دلوں کی کایا پلٹ گئی، لوگوں نے ہتھیار پھینک دیے اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے۔ (طبرانی:4/20)۔

غرض، کسی بھی انسانی سماج میں اختلاف ونزاع کا پیدا ہونا ایک فطری چیز ہے، جس سے بچنا ممکن نہیں، لیکن یہ ضروری ہے کہ جہاں آگ لگے وہاں پانی ڈالنے والے لوگ بھی موجود ہوں، جہاں سیلاب آتا ہے تو وہاں ہر شخص پانی کی ظالم موجوں کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرتا ہے ورنہ آگ پوری بستی کو اپنا لقمہ بنالے گی اور سیلاب پوری آبادی کو غرقاب کرکے رہے گا، اس لیے مسلمانوں میں جو "اربابِ حل وعقد" ہوں، یعنی ذمہ دار، سمجھ دار، بااثر، اہل علم ودانش، علماء ومشائخ، مذہبی اور سماجی قائدین ان کی، نیز ملی تنظیموں اور جماعتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلم معاشرہ میں اُبھرتے ہوئے اختلاف کی بروقت تشخیص کریں، اس کے اسباب وعوامل کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے تدارک کی طرف متوجہ ہوں، ورنہ یقیناً عنداللہ وہ اس سلسلے میں جواب دہ ہوں گے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ مسلمانوں کے جتنے تعلیمی واصلاحی اور دعوتی ادارے ہیں یا مذہبی اور سیاسی جماعتیں اور تنظیمیں اور اصلاحی تحریکیں ہیں، وہ سب اکثر اختلاف وانتشار سے دوچار ہیں، یہ جماعتیں اور تنظیمیں دولخت بلکہ سہ لخت ہوچکی ہیں، ایک تنظیم کے دو ٹکڑے اور پھر ان ٹکڑوں کی کئی ٹکڑیاں، یہ اختلاف وانتشار اور صلاحیتوں کا بٹوارہ بحیثیت مجموعی ملت کی طاقت کو کم زور اور بے اثر کردیتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ہر سطح پر مسلمانوں کی پس ماندگی اور زبوں حالی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کررہے ہیں۔

وقت ایک فلسفہ علم وآگہی

ایک گنج گراں مایہ

مولانا محمد سفیان قاسمی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نوّر اللہ مرقدہ کے اقرب ترین اجل خلفاء میں ایک بہت مؤثر اور نمایاں ترین شخصیت حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جن کی ذات کو حق جلّ مجدہ نے اپنے خزانۂ زبان وبیان سے بڑے مؤثر ودل نشین انداز میں زندگی کی حقیقت بیان کرنے کا سلیقہ عطا فرمایا تھا، قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے اپنے عہد کی بڑی مقبول شخصیات میں ان کا شمار ہوتا تھا، انہوں نے زندگی کی حقیقت پسندانہ عکاسی، مراقبۂ موت اور درس عبرت، نامی نظموں میں کی ہے۔ زیر نظر مضمون اور اس کے اقتباسات کا محرک ان ہی نظموں کے اشعار ہیں، حضرت مجذوبؒ کی درس عبرت نامی نظم کا ایک قطعہ ہے#

تجھے پہلے بچپن نے برسوں کھلایا — جوانی نے پھر تجھ کو مجنون بنایا
بڑھاپے نے پھر آ کے کیا کیا ستایا — اجل تیرا کر دے گی بالکل صفایا
جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے — یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

انسان کے وقت حیات کا اس سے زیادہ حقیقت پسندانہ تجزیہ اور کوئی نہیں ہوسکتا ہے، کیوں کہ نہ وقت کے کنارے کسی کے ہاتھ میں ہیں اور نہ اس کے دھارے کسی کے بس میں، اس کی ابتدا انسان کی پیدائش کہلاتی ہے، جب کہ اس کی انتہا انسان کی موت کا عنوان ہے، گویا انسان کا نہ پیدا ہونا اس کے اختیار میں اور نہ مرنا اس کے بس میں، چناں چہ یہ دوطرفہ بے بسی ولاچاری اس حقیقت کی بین وروشن عقلی دلیل ہے کہ موت وحیات کا یہ درمیانی وقفہ بھی ایک لحاظ سے ہمارا نہیں ہے، اگر اس درمیانی وقت "حیات" پر انسان کو قدرت حاصل ہوتی تو خواہش وخدشات، مسائل ومصائب کا رخ ہر انسان اپنے احوال کے مطابق متعین ومقرر کیا کرتا۔

جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، یہ درمیانی وقت، حیات نو بھی بخش سکتا ہے اور زندگی کو موت سے بدتر بھی بنا سکتا ہے، موت وحیات کے شکنجوں میں جکڑی بندھی یہ حیات مستعار ہمیں مختلف مراحل سے گزارتی ہے، خواہ ہمیں احساس ہو کہ نہ ہو، ہم چاہیں یا نہ چاہیں، زندگی کے یہ ادوار گزرتے جائیں گے، ہمارا مستقبل حال میں تبدیل ہوتا رہے گا اور ہمارا حال ماضی بنتا چلا جائے گا، بچپن پلک جھپکتے بچپن کی سرحد کو عبور کر کے بڑھاپے کی منزل پر لا کھڑا کر دیتا ہے اور یہ برق رفتار سیل رواں عدم سے وجود میں آ کر معدوم ہوجاتا ہے اور ہمارے ذہنوں پر واقعات کا خوش گوار وگراں بار ہلکا اور گہرا نقش

چھوڑ جاتا ہے اور زندگی انسان کو فراموش کر کے اس طرح لوٹ جاتی ہے کہ اب اس کا مقام و مرتبہ، اس کے اختیارات کے عناوین، اس کا تکبر، سماج و معاشرے میں اس کی ناگزیریت اور اس کی شخصیت کا مکمل تعارف محض دو فٹ کے کتبے میں محصور ہو کر رہ جاتے ہیں، یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کریم اپنے بلیغ و معجز انداز میں اسی طرح بیان کرتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا﴾ (الفرقان: 62)

"اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہیے۔"

یا دوسری جگہ فرمایا کہ:

﴿لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا﴾ (النازعات: 46) وہ (دنیا میں) صرف ایک شام یا صبح رہے۔

لہٰذا درس عبرت یہ ہے کہ حرکت و سکون کا مزاج رکھنے والی اس دنیا میں اگر بیش قیمت کوئی چیز قرار دی جا سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف وقت ہی ہے، اسی کا صحیح یا غلط استعمال دنیا سے لے کر آخرت تک کی منزل کا تعین کر سکتا ہے اور انسان کی محنتیں و کاوشیں، نیز ان کے بلند و بالا یا پست و مذموم نتائج و ثمرات کا انحصار صرف وقت کے صحیح یا غلط استعمال پر ہی موقوف ہے، کیوں کہ وقت ایک متحرک شے ہے، محنت اور حرکت کا ایک فطری اور کائناتی تعلق ایک دوسرے سے جزو لاینفک کے طور پر باہم مربوط ہے اور اسی محنت پر دنیا کی ترقیات کا مدار ہے اور بشرط ایمان و اخلاص نیت کے اضافے کے ساتھ اسی محنت میں دنیا سے آخرت تک کی تمام کامیابیوں کے رازہائے سربستہ بھی اسی حقیقت میں پوشیدہ و پنہاں ہیں، گویا کامل اخلاص نیت کے ساتھ لوجہ اللہ کی جانے والی حرکت اور محنت میں ہی برکت و فیروزمندی کے جملہ رازہائے سربستہ مکنون و مستور ہیں اور یہی حرکت وقت کا صحیح اور مطلوب استعمال بھی ہے۔

وقت کی اہمیت اور اس کی گراں قدری کی اگر تحلیل کی جائے اور تعمق فکر و نظر کے ساتھ غور کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ ماضی حال اور مستقبل، وقت کے اس تکون میں ہمارے پاس کیا ہے؟ کیوں کہ کل جو گزشتہ ہے وہ تو خواب ہو گیا، آج بے ہوشی و غفلت کی نذر ہو کر ماضی کے قبرستان میں دفن ہو گیا، اب رہا آنے والا کل، اس کی مثال تو ایک بھٹکے ہوئے مسافر کی سیاہ رات میں گمشدہ منزل سے مختلف نہیں ہے، پتہ نہیں ہاتھ آئے کہ نہ آئے اور اسی مرحلے پر نہ جانے کتنے لوگ دھوکے کا شکار ہو کر ڈوب گئے، جنہوں نے آج کی وسعت کو تنگ پایا اور سارا زور آنے والے کل پر ڈال کر محنتوں اور امیدوں کی کشتی کو آئندہ کل کے بحر ناپیدا کنار میں ڈال دیا۔

کسی کی قسمت نے یاوری کی تو کچھ ہاتھ لگ گیا، ورنہ نہ جانے کتنے اس خیال خام کے سہارے گم نامیوں کے اندھیروں میں ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئے، کیوں کہ جو وقت گزر گیا تو وہ قیامت تک بھی لوٹ کر نہیں آئے گا اور نہ ہی زندگی ایک لمحہ و لحظہ کے لاکھویں حصے کے بقدر پیچھے لوٹے گی، چناں چہ وقت نے جو کچھ ہمیں دے دیا وہی ہمارا سرمایہ ہے اور جو کچھ ہم سے لوٹ لیا وہ ملنے

والا نہیں ہے، کیوں کہ یہ وہ دروازہ ہے جس سے ایک دفعہ گزر گئے تو اس سے واپس جانا ممکن نہیں ہے۔

اس تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اس صحرائے کل میں جو قافلہ گم ہو گیا وہ منزل سے رہ گیا.....سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہمارے ہاتھ میں کیا ہے؟ ماضی گزر گیا، آئندہ کل ہماری دست رس سے باہر ہے۔ لہٰذا سوائے آج کے ہماری کوئی متاع نہیں، چناں چہ ہمیں جو کچھ بھی محنت کرنی ہے وہ اسی آج میں کرنی ہے، گزشتہ کل میں جو نقصان ہو گیا تھا اس کی توبہ و تلافی کا وقت ہمارے پاس یہی آج ہے اور یہ محنت کا بروقت اور صحیح استعمال ہے، جس کی بارگاہ اقدس جلّ مجدہ میں قدر دانی بھی ہے اور برکات ربانی کے ورود کی علّت کا راز بھی اسی میں پوشیدہ و مضمر ہے۔

اصحاب علم و حکم کام یابی کا نسخۂ کیمیا یہ بیان کرتے ہیں کہ گزشتہ کل کی ناکامیوں و نامرادیوں کو آج کے عمل کی تحریک بنادی جائے اور آج کے مل جانے کو بشکر و سجود عطیہ خداوندی سمجھا جائے، جب کہ آئندہ کل ایک فکر کا فریب ہے، اس کل کے بھنور میں نہ جانے کتنے ڈوبے اور ایسے ڈوبے کہ پھر ابھرنا نصیب نہ ہو سکا، وقت کا قافلہ رخت سفر باندھ کر برق رفتار تیزی کے ساتھ سرگرم سفر ہے، اس لیے آج کی جو مہلت وقت ہے، اسی کو اپنی قیمتی متاع سمجھ کر وقت کے قافلے کے ساتھ قدم بہ قدم چلتے رہو، نہیں تو یہ کاروان علم و عمل، یہ زندگی کا قافلہ غبار راہ کی طرح پیچھے چھوڑ جائے گا اور آفات و حوادث اور آلام و مصائب کی تند و تیز ہوائیں اور اس کی بلا خیزیاں حسرتوں اور نامرادیوں کی نہ جانے کن نامعلوم اور انجان وادیوں میں جا پٹخیں گی، جس میں راہ حیات کے آثار و نشانات بھی مٹ جائیں گے۔

وقت ماضی، حال اور مستقبل کے تین خانوں میں تقسیم ہے، چناں چہ اس اعتبار سے مہلت عمل کا نام ہی وقت ہے، جس میں ذاتی اعتبار سے نہ اس سیل حیات میں کوئی خیر ہے اور نہ کوئی شر ہے، بلکہ اس کے خیر و شر کا تعین اس میں ادا کیے جانے والے اعمال سے تعبیر ہے، جس کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

"خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم، ثم الذین یلونھم" (التفسیر المظھری: 27/7)

زمانوں میں سب سے خیر کا زمانہ میرا ہے، پھر اس سے متصل زمانہ، پھر اس سے متصل۔ گویا مجموعی اعتبار سے ان تینوں زمانوں پر خیر کا غلبہ ہے، اس کے بعد قیام قیامت تک کبھی خیر غالب و فائق رہے گی تو کبھی شر کی حکم رانی کا غلبہ رہے گا۔ کسی سائل نے اہل فکر و نظر سے سوال کیا کہ متاع دنیا میں وہ کون سی شے ہے، جو سب سے زیادہ طویل بھی اور سب زیادہ مختصر بھی، سب سے زیادہ تیز رفتار بھی ہے اور سب سے زیادہ سست گام بھی، سب سے زیادہ کھینچی جانے والی شے بھی ہے اور سب زیادہ نظر انداز کی جانے والی بھی اور ضائع ہو جانے پر سب زیادہ افسوس کی جانے والی بھی اور ایسی چیز بھی جو معمولی سے معمولی چیزوں کو دوام بھی بخش سکتی ہے اور غیر معمولی چیزوں کو لمحوں کے ہزارویں حصے میں فنا کے گھاٹ اتار دینے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے؟

ارباب علم و دانش نے جواب دیا کہ ایسی متاع بے بدل کا نام ہی وقت ہے، اس لیے کہ وقت سے زیادہ طویل ترین کوئی چیز نہیں، کیوں کہ یہ ابدیت کا پیمانہ ہے اور وقت سے زیادہ مختصر اور کوئی شے نہیں، کیوں کہ یہ ہمارے منصوبوں،

آرزوؤں، تمناؤں، اُمنگوں اور خواہشات کے لیے ہمیشہ مختصر اور ناکافی ثابت ہوتا ہے اور جو کسی امید و انتظار میں ہو اس کے لیے وقت سے زیادہ سست رفتار کوئی چیز نہیں اور جو خوشی و مسرت کے لمحات سے گزر رہا ہو اس کے لیے وقت سے زیادہ تیز گام او رکوئی شے نہیں ہے، طول میں اگر یہی وقت ابدیت تک پہنچ سکتا ہے تو اس کے برعکس اگر اختصار کی بات کی جائے تو یہی وقت ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں تو کیا، بلکہ کروڑوں اور اربوں حصہ میں تقسیم کیے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اس دنیا میں انسانوں کی اکثریت وہ ہے جو اس کو بے دریغ نظر انداز کرتی ہے اور سب ہی اس کے ضائع ہو جانے پر کف افسوس ملتے ہیں، وقت ہی ہے جو معمولی یا غیر معمولی کسی بھی واقعہ کو اگلی نسل تک منتقل ہونے سے پہلے ہی طاق نسیاں کے حوالے کر دیتا ہے اور ہر ایسے عمل کو لافانی و لازوال بنا دیتا ہے، جو واقعی عظیم ہو۔

اصحاب علم و آگہی نے وقت کی ماہیت و حقیقت کو اپنے اپنے فکر و نظر کے مطابق تولا اور جانچا ہے، مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنی مشہور زمانہ مکتوباتی تصنیف "غبار خاطر" کے مکتوب نمبر 23 میں رقم طراز ہیں کہ: عرب کے مشہور فلسفی شاعر ابوالعلاء معری نے زمانے کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا ہے، جس کی عکاسی درج ذیل اشعار میں کی ہے۔

ثلاثة ایام ھی الدھر کله

و ماھن الا الامس و الیوم و الغد

و ما القمر الا و احد غیر انه

یغیب و یأتی بالضیاء المجدد

(یہ سارے کا سارا زمانہ تین ہی دن تو ہے، جو گزشتہ کل، آج کا دن اور آئندہ کل ہی تو ہیں اور چاند اگر چہ ایک ہی ہے، مگر وہ غائب ہونے کے بعد اگلے دن نئی روشنی کے ساتھ طلوع ہوتا ہے۔)

لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں یہ نقص تھا کہ جسے ہم حال کہتے ہیں وہ فی الحقیقت اپنا وجود کہاں رکھتا ہے؟ یہاں وقت کا جو احساس ہمیں میسر ہے وہ یا تو ماضی کی نوعیت کا ہے یا مستقبل کی اور ان ہی زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے جسے ہم حال کے نام سے پکارنے لگتے ہیں، یہ سچ ہے کہ ماضی اور مستقبل کے علاوہ وقت کی ایک تیسری نوعیت بھی ہمارے سامنے آتی رہتی ہے، لیکن وہ اس تیزی کے ساتھ آتی اور نکل جاتی ہے کہ ہم اسے پکڑ بھی نہیں سکتے، ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں، لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا اور ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل ڈالی، اب وہ ہمارے سامنے ماضی ہے جو جا چکا ہے یا مستقبل ہے، جو ابھی آیا ہی نہیں ہے، لیکن خود حال کا کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دیتا ہے، جس وقت ہم نے پیچھا کرنا چاہا وہ حال تھا اور جو ہماری پکڑ میں آیا وہ ماضی ہے۔

گویا حقیقت حال کو بصیرت کے ساتھ قریب ہو کر دیکھیں تو واقعہ یہ ہے انسانی زندگی کی پوری مدت ایک صبح اور ایک شام سے زیادہ نہیں ہے، صبح آنکھیں کھلیں، دن امید و بیم میں گزر را، رات آئی تو پھر آنکھیں بند ہو گئیں:

﴿لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا عَشِيَّةً أَوْ ضُحَاهَا﴾ (النازعات:46)

ترجمہ: وہ (دنیا میں یا قبر میں) ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں رہے۔

یہی وقت کی حقیقت اور ماہیت ہے۔ازروئے کلام اللہ واحادیث رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بروز محشر ایک ایک چیز کی حساب دہی دین اسلام کے مسلمات کا ایک لازمی حصہ ہے، ایک ایک چیز کا حساب ہوگا، ایک ایک بات کے بارے میں باز پرس ہوگی، اعمال، افعال، اقوال، حرکات وسکنات غرض کہ حیات دنیوی کا کوئی گوشہ وجزئیہ بھی اس دائرہ حقیقت سے باہر نہیں ہوگا، کراماً کاتبین انسان کی ایک ایک حرکات وسکنات، جنبش اعمال اور گردشِ رفتار میں ظہور پذیر ہونے والی کارروائیوں کو محفوظ کرنے پر مامور ہیں۔

امتحان وآزمائش کی اس دنیا میں غفلتوں کے اسباب جابجا بکھرے ہوئے ہیں، عقل ونگاہ کو خیرہ کردینے والے مناظر قدم قدم پر قدم روکتے ہیں، نفس کی خواہشات جگہ جگہ پر جی لگانے اور لبھانے کو تیار ہیں، اس کارگہِ عالم کے جلووں کی چمک دمک دامن دل کو کھینچتی ہے، حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس پُرخار وادی کے باقسمت مسافر پر اگر رحمت حق جلّ مجدہ سایہ فگن نہ ہو تو ہدایت کے بغیر مجرد عقل کی راہ نمائی میں منزل کا پتہ پالینا ممکن ہی نہیں ہے، چناں چہ ایسے میں اس مقصد حیات:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات:56)

ترجمہ: ”اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔“

اور اس کے ہمہ جہت مقتضیات ومطالبات کو ہر دم ولحظہ اور قدم بہ قدم فکر وخیال میں تازگی پہنچاتے رہنا ہی کام یابی کی ضمانت ہے۔ گردش لیل ونہار کا کوئی لمحہ ولحظہ ایسا نہیں جو یا تو کام کو سنوارنے والا ہو یا کام بگاڑنے والا ہو، کسی بھی لمحے میں جو بھی اہم یا غیر اہم معمولی یا غیر معمولی کام کیا جائے گا، خواہ وہ خیر کا ہو یا شر کا ہو، وہی وقت کا استعمال ہے اور بروز محشر اسی کا نتیجہ سامنے آئے گا۔ لہٰذا اخلاص نیت کے ساتھ فکر وخیال کی اصلاح کے لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یہ نہایت جامع دعا تیر بہ ہدف ہے۔ ”اے مالک دوجہاں! ہم آپ سے اس مہلت حیات کی گھڑیوں میں بہتری اور عمر عزیز میں خیر وبرکات کا سوال کرتے ہیں۔“ وما توفیقی إلا باللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اسلام میں وقف کی اہمیت

اور وقف ترمیمی بل ۲۰۲۴ء

مفتی امانت علی قاسمی

وقف ایک عبادت ہے جس کا مقصد اللہ تعالی کی رضا حاصل کرنا اور خلق خدا سے محبت کا اظہار کرنا ہے، جب کوئی شخص زمین وقف کرتا ہے تو واقف کی ملکیت ختم ہوجاتی ہے اور اس زمین پر اللہ تعالی کی ملکیت قائم ہوجاتی ہے؛ اسی وجہ سے حضرات فقہاء کرام لکھتے ہیں کہ وقف کے مکمل ہوجانے کے بعد وقف کرنے والے کی ملکیت اس زمین سے ختم ہوجاتی ہے، اب اس زمین پر واقف کا بھی اختیار نہیں ہوتا ہے اس زمین پر وراثت قائم نہیں ہوتی، اس زمین کو واقف نہ عاریت پر دے سکتا ہے نہ رہن پر دے سکتا ہے، واقف کے انتقال کر جانے کے بعد واقف کے ورثہ کا اس زمین پر کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح وقف کرنے کی کچھ شرطیں بھی ہیں اس میں ایک شرط یہ ہے کہ واقف اس چیز کا مالک ہو، واقف نے اپنے اختیار اور رضامندی سے وقف کیا ہو، وہ شئ مملوکہ ہو، واقف نے اس کو اپنی ملکیت سے علاحدہ کر دیا ہو۔ اگر وقف کی گئی چیز زمین ہے تو اس کے ساتھ کسی کا کوئی حق متعلق نہ ہو۔

وقف کے فوائد: وقف کے مختلف فائدے ہیں: وقف کا ایک فائدہ تو اللہ تعالی کی رضا وخوشنودی ہے، واقف کو اس وقف کی وجہ سے ہمیشہ ثواب ملتا ہے، مدارس، مساجد، قبرستان، خانقاہوں کا قیام اس کے ذریعہ عمل میں آتا ہے، اور ان چیزوں سے جو بھی نیکی انجام دی جاتی ہے اس کا ثواب وقف کرنے والے کو بھی ملتا ہے، اسلام کا اجتماعی سماجی ومعاشی نظام اس کے ذریعہ قائم ہوتا ہے، غریبوں کی مدد ہوتی ہے، یتیموں کی کفالت ہوتی ہے، عوامی فلاح وبہبود کے کام انجام دئے جاتے ہیں۔ وقف صرف غریبوں کے لیے نہیں ہوتا؛ بلکہ اس سے عام لوگ بلکہ مالدار بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں مثلا: کوئی وقف مسافر خانہ کے لیے ہے تو کوئی بھی مسافر اس میں قیام کرسکتا ہے، اسکول وکالج کے لیے وقف ہے تو کوئی بھی وہاں سے تعلیم حاصل کرسکتا ہے۔ وقف کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ اگر وقف کا صحیح استعمال کیا جائے تو ملک کا اقتصادی ڈھانچہ مستحکم ہوسکتا ہے ،مسلمانوں میں غربت کے خاتمے کے لیے مؤثر کردار ادا کیا جاسکتا ہے، مسلمانوں کو تعلیمی پسماندگی سے نکال کر تعلیم کے قومی دھارے میں لا کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

وقف کی بنیادی طور پر دو قسمیں کی جاتی ہیں: وقف عام جسے عمومی فلاح و بہبود کے لیے وقف کیا جاتا ہے جیسے مساجد، سڑکوں، تعلیمی اداروں کے لیے وقف کرنا اور دوسری قسم، وقف خاص جو مخصوص خاندان، اولاد یا کسی مخصوص شخص پر وقف کیا جاتا ہے۔

وقف کے فضائل: وقف کو اسلام کی خصوصیات میں شمار کیا جاتا ہے، امام شافعی کا قول ہے کہ اسلام سے پہلے وقف کا نظام نہیں تھا، اسلام میں اس نظام کا آغاز ہوا قرآن کریم میں جب یہ آیت نازل ہوئی: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون (آل عمران: ۹۲) کہ تم اس وقت تک خیر یعنی نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنی سب سے محبوب چیز راہ خدا میں خرچ نہ کر دو۔ تو حضرت ابوطلحہؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور فرمایا کہ مجھے بیر حاباغ (جو کہ مدینہ میں مسجد نبوی کے قریب بہت قیمتی زمین تھی) مجھے بہت پسند ہے، میں اسے راہ خدا میں صرف کرتا ہو۔ چناں چہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشورہ سے انہوں نے وہ زمین اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یارسول اللہ! مجھے خیبر میں جو حصہ مال غنیمت کے طور پر ملا ہے وہ سب سے زیادہ پسند ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا مشورہ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اصل کو روک کر پھل کو راہ خدا میں صرف کر دو یعنی وقف کر دو تا کہ زمین باقی رہے اور اس کا پھل غریبوں کے لیے وقف ہو جائے۔ (تفسیر ابن کثیر ۲ / ۶۳)

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مومن کو اس کے مرنے کے بعد اس کی جن نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اس میں وہ "علم" ہے جو اس نے دوسروں کو سکھایا اور اس کو پھیلایا یا نیک اولاد ہے یا قرآن کا کسی کو وارث بنایا، یا مسجد بنایا یا مسافر خانہ بنایا یا نہر بنادی، یا وہ صدقہ جس کو اس نے اپنی زندگی اور صحت کے زمانہ میں نکالا ان چیزوں کا ثواب اس کو مرنے کے بعد بھی ملتا ہے۔ (سنن ابن ماجہ، ۲۴۲)

حضرت سعد بن عبادہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ یارسول اللہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے ان کی طرف سے کون سا صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پانی صدقہ کرو! چناں انہوں نے اپنی والدہ کی طرف سے کنواں کھدوایا اور اسے وقف کر دیا۔ (سنن ابی داؤد) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بیر رومہ کا پانی میٹھا تھا لیکن بغیر قیمت کے کوئی اس سے پانی نہیں پی سکتا تھا، حضرت عثمان نے بیر رومہ کا کنواں خرید کر وقف کر دیا (سنن ترمذی) حضرت جابر کہتے ہیں میرے علم میں مہاجرین و انصار میں سے کوئی نہیں تھا جن کے کوئی چیز ہو اور انہوں نے اس کو وقف نہ کیا ہو۔ (الموسوعۃ الفقہیہ الکویتیۃ، ۴۴ / ۱۱۱) یعنی حضرات صحابہ کے درمیان جائداد کا وقف کرنا ایک عام بات تھی، ہر کوئی اپنی استطاعت کے بقدر جائداد یا دیگر چیزوں کو وقف کرتا تھا۔ اس لیے کہ اوقاف کے ذریعہ مسلم سماج سے غربت کا خاتمہ ہو سکتا ہے، کمزور لوگوں کی دائمی طور پر مدد ہو سکتی ہے، اور وقف کرنے والے کو ہمیشہ ہمیش کے لیے ثواب ملتا رہتا ہے۔

ہندوستان میں اوقاف کی تاریخ: ہندوستان میں مسلمانوں نے قریب ایک ہزار سال تک حکومت کی اس دوران مسلم بادشاہوں نے بہت سی مسجدیں اور مزارات بنوائے، اور ان پر جائدادیں وقف کیں تا کہ اس کا ہمیشہ نظام جاری رہ سکے کہا جاتا ہے سب سے پہلے فیروز شاہ تغلق کے دور حکومت میں ہندوستان میں وقف کا نظام منظم ہوا اس کے بعد شیر شاہ سوری اور عالمگیر اورنگزیب نے مختلف جائدادیں وقف کیں، اس کے علاوہ وقف کی اسی اہمیت اور ثواب جاریہ کے پیش نظر

ہمیشہ مسلمان اپنی قیمتی جائدادوں کو وقف کرتے رہے، ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نوابوں نے مدارس قائم کئے اور اس کے نظم کو چلانے کے لیے جائدادیں وقف کیں تاکہ اس کے ذریعہ مدارس کا نظام سہولت سے جاری رہ سکے۔

انگریز عہد حکومت میں مدارس کو بند کردیا گیا اور وقف کی جائدادوں کا بے دریغ غلط استعمال ہوا، بہت سی جائدادوں کو انگریزوں نے اپنے قبضہ میں لے لیا پھر جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو آئندہ کے لیے وقف ایکٹ ۱۹۲۳ء بنایا گیا، پھر ملک کی آزادی کے ۱۹۵٤ء میں وقف ایکٹ بنایا گیا اور مختلف مواقع پر اس میں ترمیم کی گئی، اس قانون کا مقصد وقف جائداد کو تحفظ فراہم کرنا اور اس کے غلط استعمال کو روکنا تھا۔ لیکن افسوس کہ ان تمام تر قانون کے بعد بھی وقف کا تحفظ نہیں ہوسکا، پھر ۱۹۸٤ء میں نیا وقف قانون آیا، لیکن اس میں بھی مسلمانوں کے مطالبات کو نظر انداز کیا گیا پھر ۱۹۹۵ء میں اور دوبارہ ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۳ء میں وقف میں ترمیم کی گئی، آخری وقف ایکٹ میں کسی حد تک مسلمانوں کے مطالبات کو سنا گیا تھا اور کچھ امید تھی کہ اگر اس قانون پر ایمان داری سے عمل ہوتا تو اوقاف کا بہتر استعمال ہوسکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور اب ۲۰۲٤ء میں حکومت نیا ترمیمی بل لے کر آئی ہے۔

اس وقت ہندوستان میں سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۹/لاکھ ایکڑ سے زائد زمینیں اوقاف کی ہیں، ہندوستان میں فوج اور ریلوے کے بعد سب سے زیادہ زمینیں اوقاف کے پاس ہیں۔ اسی وجہ سے جن لوگوں کو مسلمانوں کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا ان کو مسلمانوں کی اوقاف سے بھی تکلیف ہے اور وہ کسی قیمت ان جائداوں کا ناجائز قبضہ چاہتے ہیں۔

نئے بل میں کیا ہے؟ اس نئے بل میں تقریبا چالیس ترامیم کی گئی ہیں، ہمیشہ کی طرح حکومت نے مسلمانوں کو یہ جھانسہ دیا ہے کہ یہ قانون مسلمانوں کے مفاد کے لیے لایا گیا، اس بل سے خواتین، بچوں اور کمزور مسلمانوں کو فائدہ ہوگا لیکن اس بل کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وقف مسلمانوں کا مذہبی عمل ہے اور اس کے احکامات فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں اس کے خلاف کرنا درست نہیں ہے۔ لیکن حکومت نے اس ترمیمی بل کا خاکہ بناتے وقت کسی بھی مسلم تنظیموں یا علماء کرام سے مشورہ نہیں کیا ہے۔ اس بل کا اگر ہم جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی نیت درست نہیں ہے۔

اس ترمیم میں ایک بڑی تبدیلی یہ کی گئی ہے کہ اب نئے وقف کونسل میں چاہے مرکزی وقف بورڈ ہو یا صوبائی وقف بورڈ اس کے ارکان میں غیر مسلم بھی شامل ہوں گے، بلکہ وقف بورڈ کا چیف ایگزیکیٹیو غیر مسلم بن سکتا ہے، اسی طرح وقف کا سی ای او غیر مسلم بن سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب گرودوارہ کمیٹی میں کوئی مسلمان نہیں ہوتا ہے اور ہندوؤں کی جو مندر وغیرہ کی کمیٹی ہوتی ہے اس میں کوئی مسلمان ممبر نہیں ہوتا ہے، یوپی کیرالہ، کرناٹک، تمل ناڈو می ایسے قوانین ہیں کہ ہندو مذہبی املاک کے معاملات میں ہندو ہی اس کا ممبر ہوگا، تو پھر وقف بورڈ میں کوئی ہندو کیوں کر ممبر ہوگا اور اس کے مرکزی عہدوں پر ہندو کیوں کر فائز ہوسکتا ہے، کیا یہ مسلمانوں کی املاک کو غیر مسلموں کو دینے جیسا نہیں ہے، جب قانون کے اعتبار سے غیر مسلم وقف نہیں کرسکتا ہے تو وقف کا ممبر کیوں کر ہوسکتا ہے؟ یہ شق خود حکومت کے منشاء پر سوال کھڑے کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ

وقف کی حیثیت کو تبدیل کرنا اور اس کا غلط استعمال کرنا ہے۔

جب اس کے مرکزی کمیٹی میں غیر مسلم ہوں گے تو نیچے بہت سے عہدوں پر بھی یقیناً بہت سے غیر مسلم ہوں گے اس طرح وقف بورڈ کے ذریعہ اگر چند مسلمانوں کو ملازمت مل جاتی ہے وہ بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔اس نئی ترمیم میں یہ بھی ہے کہ اوقاف کی جائدادوں کو کس طرح استعمال کیا جائے گا اس کا حکومت تعین کرے گی ،ظاہر ہے کہ یہ قانون وقف کے اصول کے خلاف ہے اس لیے کہ ،فقہ کی کتابوں میں مستقل وقف کا ایک باب ہوتا ہے،جس میں وقف کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے،مسجد کے وقف کے احکام الگ ہیں ، مدارس کے وقف کے احکام الگ ہیں ،دیگر اوقاف کے احکام الگ ہیں،فقہ کی کتابوں میں ایک مسئلہ صراحت کے ساتھ لکھا ہوا کہ واقف کی شرط شریعت کی نص کے درجہ میں ہے یعنی اگر واقف نے وقف کرتے وقت اس وقف کا مصرف طے کر دیا ہے تو جس طرح شریعت کی صراحت پر عمل کرنا ضروری ہے اسی طرح واقف کی شرط پر عمل کرنا ضروری ہوگا حتی کہ اگر واقف نے مدرسہ کے نام پر وقف کیا ہے تو اس کو مسجد میں استعمال کرنا یا قبرستان کے نام پر وقف کیا ہے اس کو مدرسہ میں استعمال کرنا شرعی طور پر درست نہیں ہے۔

جب کہ اس قانون سے حکومت وقف کو جہاں چاہے گی استعمال کر سکتی ہے اس کا دو بڑا نقصان ہوگا ایک تو یہ کہ وقف کی جائدادیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جائیں گی اور دوسرا بڑا نقصان یہ ہوگا کہ آئندہ کے لیے مسلمان وقف کرنے سے رک جائیں گے اور بہت بڑے خیر اور ثواب سے محروم ہو جائیں گے۔نئے قانون میں یہ بھی ہے کہ جو شخص اسلام پر پانچ سال سے زندگی گزار رہا ہے وہی وقف کر سکتا ہے جس کے اسلام میں داخل ہوئے ابھی پانچ سال نہیں ہوئے ہیں اس کا وقف قابل قبول نہیں ہوگا۔ظاہر ہے کہ یہ بھی اسلامی شریعت کے اصول وقف کے خلاف ہے اسلام میں تو غیر مسلم کا بھی وقف کرنا درست ہے، جب کہ یہاں پر مسلمان ہونے کے بعد بھی اس کا وقف درست نہیں ہے۔یہ ایک مسلمان کو ایک عبادت کی ادائیگی سے روکنے کے مترادف ہے اور مسلمان کو کسی عبادت کے انجام دہی سے روکنا خود دستور ہند سے دئے گئے بنیادی حقوق کے خلاف ہے۔

دستور کی دفعہ ۲۵ میں ہے کہ ہر شخص کو آزادی سے مذہب قبول کرنے ،اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہے۔اسی طرح دفعہ ۲۶ میں ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہبی اور خیراتی اغراض کے ادارہ قائم کرنے اور از خود اس کا انتظام چلانے کا اختیار ہے(بھارت کا آئین،ص ۵۳)اس نئی ترمیمی بل میں ایک شق یہ بھی ہے کہ جو اوقاف کی جائدادیں باضابطہ طور پر واقف کی طرف سے رجسٹرڈ نہیں ہیں بلکہ اسے صرف وقف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اسے وقف تسلیم نہیں کیا جائے گا،وقف کے درست ہونے کے لیے رجسٹرڈ ہونا لازم ہوگا۔یہ قانون بھی اسلام کے اصول وقف کے خلاف ہے اس لیے کہ حضرات فقہاء نے زبانی طور پر وقف کو درست قرار دیا ہے۔

اس قانون کی بنیاد پر بہت سی جائدادیں وقف ہونے سے نکل جائیں گی اور حکومت ان جائدادوں پر اپنا تسلط

حاصل کرلے گی، اس لیے کہ ہندوستان میں اوقاف کی تاریخ بہت پرانی ہے، اور بہت سی مساجد ہیں جو چار سو یا پانچ سو سال پرانی ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا کوئی ریکارڈ تلاش کرنا ممکن نہیں ہے، اس کے وقف ہونے کا یہی ثبوت ہے کہ اس کو اتنے سالوں سے بطور وقف کے استعمال کیا جارہا ہے۔ قانون کی یہ شق بھی سیدھے طور پر مسلمانوں کے اوقاف کو ہڑپنے اور ان کو اپنی اوقاف سے بے دخل کرنے جیسا ہے، اس طرح بہت سی مساجد اور مدارس بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل سکتے ہیں۔

بل میں یہ بھی ہے کہ کوئی شخص اگر اپنی پوری جائداد کو وقف کرے تو اس کا ایک تہائی ہی وقف مانا جائے گا، یہ مسئلہ بھی شرعی طور پر درست نہیں ہے، اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں صحت کی حالت میں اپنی پوری جائداد وقف کردے تو وہ وقف درست ہے ہاں اولاد کو محروم کرنا درست نہیں ہے، بعض مرتبہ کسی کا کوئی قریبی وارث نہیں ہوتا جس نے اس کی دیکھ ریکھ کی ہو اور اس کی زندگی کی آخری لمحات میں اس گاؤں کی مسجد یا مدرسہ کمیٹی نے اس شخص کی دیکھ ریکھ کی تو وہ شخص اپنی پوری جائداد مسجد کے نام یا مدرسہ کے نام وقف کردیتا ہے تو وہ وقف درست ہے شرعی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے جب کہ اس قانون میں ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ایک تہائی سے زیادہ کو درست نہیں مانا گیا ہے۔

نئے قانون کی ایک شق یہ ہے کہ اختلاف نزاع کی صورت میں وقف کے ہونے نہ ہونے کا اختیار ضلع مجسٹریٹ کو ہوگا ابھی اس سلسلے میں وقف ٹربیونل ہے جس میں یہ فیصلہ ہوتا ہے جس کو صوبائی چیف جسٹس مقرر کرتا ہے لیکن اگر تمام تر اختیارات ضلع انتظامیہ کو دے دیا گیا کلکٹر جس زمین کے بارے میں یہ لکھ دے کہ یہ سرکاری زمین ہے تو وہ سرکاری زمین مان لی جائے گی اس طرح جہاں جہاں مسجد و مندر کا مقدمہ چل رہا ہے وہاں آسانی سے صرف کلکٹر سے لکھوا کر زمین کو حاصل کیا جاسکتا ہے، اسی طرح اوقاف کی نصف جائدادوں پر اس وقت خود حکومت قابض ہے اگر صوبہ کے وزیر اعلی کا کوئی حکم ضلع انتظامیہ کو آجائے تو ضلع انتظامیہ کے لیے اس کے خلاف فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس طرح وقف بورڈ کے اختیارات دھیرے دھیرے ختم ہوجائیں گے۔

بل کی تمام شقوں کو پڑھا جائے تو صاف ہوجاتا ہے کہ وقف کے تعلق سے حکومت کی نیت درست نہیں ہے، مسلمانوں کی اتنی بڑی جائدادوں کو اپنے قبضہ میں لے کر مزید مسلمانوں کو مفلوج کرنے اور اپنے لوگوں کو فائدہ پہونچانے کا منشاء ہے۔ موجودہ قانون کی وجہ سے واقف کے منشاء کے خلاف وقف کا استعمال ہوگا، وقف ٹربیونل کی جگہ کلکٹر راج قائم ہوگا اور کلکٹر جو چاہے گا فیصلہ کرے گے، جن وقف کی جائدادوں پر نزاع ہے ان میں کلکٹر کا فیصلہ آخری ہوگا، مجوزہ قانون کی وجہ سے خود حکومت سابقہ اوقاف کے قوانین بے حیثیت ہوجائیں گے۔ وقف جو کہ شرعی عمل سے اس میں حکومت کی مداخلت ہوگی اور مذہبی کاموں پر عمل کی آزادی سلب ہوجائے گی۔ وقف بورڈ کی خودمختاری خطرے میں پڑجائے گی۔

عصرِ حاضر اور بچوں کی ابتدائی تعلیم وتربیت

(قسط نمبر:۱) ڈاکٹر ساجد خاکوانی

ابتدائی تعلیم کا آغاز عہدِ الست کے ساتھ ہو گیا تھا، جب روحانی وحقیقی وجود ملتے ہی سب سے پہلے معرفتِ رب عطا کی گئی تھی اور ایک وعدہ لینے کے بعد اس دنیا میں بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ تاہم اگر کہا جائے کہ ابتدائی تعلیم کا آغاز ماں کے پیٹ میں ہی ہو جاتا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے فطرت ہی تعلیم یا ابتدائی تعلیم کا آغاز کرتی ہے اور ہر ہر عضو کو اس کا فرضِ منصبی ازبر کراتی ہے۔ آنکھوں کو دیکھنا سکھایا جاتا ہے، کانوں کو سننا سکھایا جاتا ہے، دل کو دھڑکنا اور معدے کو جہاں ہاضمہ کی ذمہ داری سونپی جاتی، وہاں جگر کا کام خون کی فراہمی ہوتا ہے اور گردوں کو خون صاف کرنے کا فن اس ابتدائی تعلیم میں ودیعت کیا جاتا ہے، علیٰ ہٰذا القیاس۔

قدرت کے کام میں کوتاہی تلاش نہیں کی جاسکتی، کیوں کہ اللہ نے سورہ ملک میں کہا: ﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَّا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ﴾ ترجمہ: جس نے سات آسمان اوپر تلے بنائے، تو رحمٰن کی اس صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھے گا، تو پھر نگاہ دوڑا، کیا تجھے کوئی شگاف دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نگاہ کر، تیری طرف نگاہ ناکام لوٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہوگی۔

جس نے پوری کائنات بغیر کسی خامی کے بنائی ہے اور اسے بطور مثال انسان کے سامنے پیش کیا، اس کا تخلیق کردہ اشرف المخلوقات تو بلاشبہ: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (والتین) ترجمہ: بے شک ہم نے انسان کو بڑے عمدہ انداز میں پیدا کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار ہے۔ اس فنِ تخلیق کو اللہ تعالیٰ نے نزولِ قرآن کی اولین وحی کے ساتھ تذکرہ کیا اور ماں کے پیٹ کے دورانیہ کا ہی تذکرہ کیا جہاں انسان فطرت کی طرف سے اپنی ابتدائی تعلیم کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔

قدرت تو اپنے کارِ تخلیق میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتی، لیکن انسان اپنی بے اعتدالیوں اور حدود اللہ سے گزر جانے والے نافرمانی کے رویوں کے باعث خدائی تخلیق میں بگاڑ کے اثرات کا بری طرح سے سامنا کرتا ہے اور پریشانیوں کا شکار ہو رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس طرح بنائی ہے کہ بہت کچھ انسان کے حواسِ خمسہ سے پوشیدہ رکھا گیا ہے اور اسے ﴿یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ﴾ کی تلقین کی گئی ہے۔ غیب کی ان اخبار میں جو حواسِ خمسہ کی دست رس سے باہر رکھے گئے ہیں ایک روحانی دنیا بھی ہے۔

روحانیت بھی بتاتی ہے کہ باپ سے وابستہ رزقِ حلال اور ماں کے اثرات براہِ راست پیٹ میں ابتدائی تعلیم پر ثبت ہورہے ہوتے ہیں۔ اگر ماں ابتدائی تعلیم کے اس دورانیے میں پاک صاف رہے گی، عفت و پاک دامنی اس پر ختم ہوگی، صوم وصلوٰۃ کی پابند رہے گی، اذکار ودعوات وتسبیحات ووظائف اس کے معمولات کا حصہ ہوں گے، تلاوتِ قرآن مجید میں ناغہ نہیں کرے گی، اپنی خانگی ذمہ داریاں وخدمت گاریاں بھی مقدور بھر ادا کرتی رہے گی اور کسی تکلیف پیش آجانے کی صورت میں ہائے وائے اور چیخنے چلانے کی بجائے صبر کا دامن تھامے رکھے گی تو وہ نیک اولاد کو جنم دے گی اور اس کے رحم میں ابتدائی تعلیم کی خواندگی تقویٰ اور پاک بازی سے عبارت ہوگی اور بصورتِ دیگر یہ دنیا فساق وفجار اور رجل الدرھم والدینار اور پیٹ کی خواہش اور پیٹ سے نیچے کی خواہش کے پجاریوں سے بھری پڑی ہے۔ جن کے لیے قرآن نے کہا ہے: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾۔

جنم لیتے ہی ابتدائی تعلیم کا اگلا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ مرحلہ کم وبیش دس سالوں تک محیط ہوتا ہے، جس کے بعد پھر ثانوی تعلیم کے مراحل شروع ہوجاتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کی چار بنیادیں: اوائلِ عمری، معصومیت، خالی الذہنی اور مشاہدہ ہیں اور ابتدائی تعلیم کے چھ عناصر: خودشناسی، خداشناسی، حفظ، بنیادی اخلاقیات اور مبادیاتِ لسان وحسابیات اور تقابلات ہیں۔

ابتدائی تعلیم کی پہلی بنیاد اوائل عمری میں اولین جو کلام کانوں کے راستے دماغ کی گہرائیوں اور تاریکیوں تک پہنچتا ہے وہ پتھر پر لکیر کی طرح اَن مٹ اور عمر بھر کے لیے امر ہوجاتا ہے، چناں چہ دنیا میں قدم رکھتے ہی اس کے دائیں کان میں اذان دے کر اسے ابتدائی واولین تعلیم میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور درسِ توحید سے آشنائی فراہم کردی جاتی ہے اور بائیں کان میں اقامت کہہ کر اسے نماز جیسی بزرگ عبادت کا تعارف کرادیا جاتا ہے، جو عمر بھر کا ایک وظیفہ ہے، جو اسے تاحیات اور تادمِ مرگ جاری رکھنا ہے کہ روزِ محشر سب سے پہلے اسی کے بارے میں پرسش ہونی ہے۔

اذان اور اقامت کے ابتدائی اسباق اس کے تاریک دماغ میں روشنی کا باعث بنتے ہیں اور اس کا قلب ونظر وذہن وفکر نور سے بھر جاتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں فرمایا: ﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (البقرۃ: 257) ترجمہ: اللہ ایمان والوں کا مددگار ہے اور انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے اور جو لوگ کافر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں جو انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں، یہی لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

لیکن ابتدائی تعلیم ابھی نامکمل ہے، کیوں کہ معلم کی تعیناتی ابھی باقی ہے، چناں چہ خاندان کے کسی نیک ومتقی ودین دار بزرگ مرد یا خاتون کے ہاتھوں شہادت کی مقدس انگلی سے گھٹی دی جاتی ہے، تاکہ بزرگ کی نیک فطرت اس نومولود میں عود کر آئے۔ عہدِ نبوی میں بچوں کو گھٹی کے لیے محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا جاتا تھا اور روایات کے مطابق

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگشت مبارک سے بچے کے تالو پر شہد لگا دیتے تھے، جسے وہ چاٹتا رہتا تھا۔ یوں ابتدائی تعلیم کا قیمتی ترین مرحلہ ایک غیر رسمی تعلیمی ادارے میں شروع ہوجاتا ہے۔اس عمر میں بچے کا ذہن بالکل اور کلیتاً خالی سلیٹ اور صاف تختی کی مانند ہوتا ہے۔ بہ ظاہر بچہ سو رہا ہوتا ہے یا خاموش ہوتا ہے یا صرف دائیں بائیں دیکھتے ہوئے نظر آتا ہے یا خود سے کھیل رہا ہوتا ہے اور مصروفِ محض ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت یہ سارا ماحول، آوازیں، مناظر اور خورونوش وغیرہ اس کے ذہن پر اپنے قوی نقوش چھوڑ رہے ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ آنے والے دنوں میں اس کی شخصیت اور یقینی طور پر اس کے کردار کا حصہ بن جائے گا۔

ابتدائی تعلیم کی دوسری بنیاد معصومیت کے ساتھ ایک خاص عمر میں بچے کو رسمی تعلیمی ادارے میں داخل کر دیا جاتا ہے، یہ وہ عمر ہوتی ہے جب بچہ اپنی حوائجِ فطریہ سے واقف اور کسی حد تک خود کفیل بھی ہو چکا ہوتا ہے، عمومی طور پر یہ ساڑھے تین سال کی عمر ہوتی ہے، لیکن اس میں کمی بیشی کی گنجائش ممکن ہے۔ابتدائی تعلیم میں بچے کی تربیت میں یہ قربانی شامل ہے کہ وہ چند گھنٹے کے لیے ماں کی گود چھوڑ کر اپنے ابتدائی تعلیم کے ادارے میں آجاتا ہے۔ ابتدا میں معصوم بچے پر یہ تبدیلی بوجھل ہوتی ہے، کچھ بچے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں اور ابتدائی تعلیم کے ادارے میں جاتے ہوئے روتے ہیں، ٹانگیں چلاتے ہیں، شور مچاتے ہیں اور ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح گھر کو لوٹ جائیں، جو فرد انہیں چھوڑنے جاتا ہے اس سے چمٹے رہتے ہیں یا پھر تقاضا کرتے ہیں کہ یہ بھی ادارے میں رک جائے۔

لیکن کچھ بچے بظاہر اظہار نہیں کرتے، خاموش رہتے ہیں، سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے رہتے ہیں، اپنا بستہ اور کتابیں کاپیاں سنبھال سنبھال کر رکھتے ہیں، کیوں کہ اس اجنبی ماحول میں یہی بستہ اس کا اپنا ہے اور باقی سب نا آشنا اور غیر ہیں اور اگر اسی ادارے میں ان کا کوئی بھائی، بہن، پڑوسی یا رشتہ دار پڑھتا ہو تو وہ چاہتے ہیں کہ اسی کے ساتھ جا کر بیٹھ جائیں۔ یہ بچے ادارے کے بند ہونے اور چھٹی کے وقت کا بہت بیتابی سے انتظار کرتے ہیں اور دوڑ لگا کر ایسے نکلتے ہیں جیسے انہیں باندھ کر رکھا گیا تھا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اپنے ہم جولیوں سے دوستیاں ہوجاتی ہیں اور معلم اور ماحول سے مانوس ہوجاتے ہیں اور پھر شوق سے بھاگتے ہوئے مدرسے جاتے ہیں اور وہاں بہت اچھا وقت گزارتے ہیں، یہ ان کی معصومیت کا ایک اور پرتو ہے۔

ابتدائی تعلیم کی تیسری بنیاد خالی الذہنی ہے، اس میں بچے کو سب سے پہلے عقیدہ یاد کرایا جاتا ہے، یہاں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ صرف مثبت پہلو یاد کرائے جائیں، کیوں کہ منفی پہلوؤں کے باعث ابتدا سے ہی اس کا خالی ذہن مشکل میں پڑ سکتا ہے۔عقیدہ کی تعلیم اسے سنائی جائے گی اور اسے دہراتا رہے گا اور اس طرح ذہن نشین ہوجائے گی۔

(جاری)

فقہ وفتاویٰ

جنت میں میاں بیوی کے تعلق کی کیا نوعیت ہوگی؟

نیز کیا جنت اور اُس کی نعمتیں صرف مَردوں کے لیے ہیں؟

ادارہ

سوال.....کیا فرماتے ہیں مفتیانِ کرام اس بارے میں کہ:1-دنیا میں میاں بیوی ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہیں تو کیا جنت میں بھی اکٹھے ہی ایک ہی جگہ/گھر میں رہیں گے؟2-دنیا میں بیوی اپنے شوہر کے تابعدار رہتے ہوئے زندگی گزارتی ہے،یعنی جو میاں صاحب کہتے ہیں ویسا کرتی ہے تو کیا بیوی جنت میں بھی شوہر کے تابعدار ہوگی؟ یا تابعداری سے آزاد ہوگی اور اپنی زندگی جیسے چاہے گی گزارے گی؟3-اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیثِ مبارکہ میں جتنے بھی جنتیوں کے انعامات بتائے ہیں،کیا وہ انعامات مرد اور عورت کے لیے برابر ہوں گے یا مردوں کے لیے زیادہ انعامات ہوں گے اور عورتوں کے لیے کم؟4-بحیثیت عورت میں جب یہ پڑھتی ہوں کہ شوہر کو جنت میں ستر ستر حوریں ملیں گی تو میرے خیال میں یہ بات آتی ہے اور تنگ کرتی ہے کہ پھر جنت میں بیوی کی اپنے شوہر کے سامنے ان حوروں کے ہوتے ہوئے کیا اہمیت ہوگی؟ یعنی بیوی اور حوریں کیا برابر ہوں گی؟5-جنت میں عورتوں کو کیا انعامات ملیں گے؟

برائے مہربانی تھوڑی تفصیل لکھ دیں،تاکہ عورت کو بھی سکون حاصل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں کے لیے ہی نہیں، بلکہ عورت کے لیے بھی برابر کی جنت بنائی ہے۔اصل میں جب بھی علماء کے بیانات سنیں یا علماء کی کتابیں پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت صرف مردوں کے لیے بنائی گئی ہے اور اس میں سارے انعامات بھی صرف مردوں کے لیے ہی ہیں۔عورت صرف مرد کے سکون کے لیے بنائی گئی ہے،بذاتِ خود عورت کی کوئی حیثیت نہیں۔ایسا لگتا ہے کہ عورت کوئی اور مخلوق ہے،جبکہ اصل مخلوق تو مرد حضرات ہیں۔ برائے مہربانی جنت کے بارے میں مزید جاننے کے لیے اچھے علماء کی کتابوں کا نام بتایئے،تاکہ عورتوں کو بھی خوشی محسوس ہو۔(آپ کی بہن)

جواب.....**الجواب باسمہٖ تعالیٰ** واضح رہے کہ مؤمن کے لیے سب سے اہم چیز اپنی زندگی شریعت کے مطابق گزارنا ہے،اس دنیا کے بعد یہی چیز کام آنی ہے،اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے جنت کا حصول مرد یا عوت کسی خاص جنس کے ساتھ نہیں رکھا ہے، بلکہ جو کوئی مومن ہوگا اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائیں گے،پھر جب انسان اللہ تعالیٰ کے فضل واحسان سے جنت میں داخل ہوجائے تو وہاں اس کا دل ہر قسم کے میل اور بُرے خیالات سے پاک ہوگا،وہاں کسی قسم کے بے ہودہ خیالات نہیں آئیں گے،لہٰذا سائلہ کو چاہیے کہ وہ شریعت پر عمل پیرا ہو کر اللہ تعالیٰ کو راضی کرے،دیگر باتوں

میں پڑ کر اپنے جذبے کو ماند نہ ہونے دے۔

1- جنت میں اللہ تعالیٰ میاں بیوی کو ایک ساتھ رکھیں گے، بلکہ اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک جنت میں داخل ہو جائے اور دوسرا اپنے اعمال کی وجہ سے پیچھے رہ جائے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل سے جنت میں پہنچائیں گے، اگر دنیا میں دونوں کے درمیان کوئی رنجش ہو بھی تو اللہ تعالیٰ جنت میں ان رنجشوں کو ختم کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اس کی بیوی کو تمام حوروں کی سردار بنائیں گے۔ 2- جنت میں اللہ تعالیٰ ہر وہ چیز مہیا کریں گے، جسے انسان کا دل چاہے گا، وہاں کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی، جنت کی زندگی کو دنیا کی زندگی سے موازنہ اور قیاس کرنا درست نہیں، عورت بھی اپنی من چاہی زندگ گزارے گی، لیکن وہاں دنیا کی زندگی کی طرح کسی قسم کی کوئی بے ہودگی نہیں ہوگی۔ 3- قرآن کریم اور سنتِ مطہرہ میں جنتیوں کے لیے جو جو نعمتیں بتلائی گئی ہیں، ان نعمتوں میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ 4- عورت جنت میں اپنے شوہر کو ملنے والی حوروں سے افضل اور ان کی سردار ہوگی۔ 5- نیک عورت اگر شادی شدہ ہے تو جنت میں اپنے جنتی شوہر کے ساتھ رہے گی اور شوہر کو ملنے والی حوروں کی سردار ہوگی، اور اللہ تعالیٰ اس عورت کو ان سب سے حسین و جمیل بنائیں گے اور وہ میاں بیوی آپس میں ٹوٹ کر محبت کرنے والے ہوں گے۔ اور اگر دنیا میں عورت کے متعدد شوہر ہوں، یعنی عورت نے اپنے شوہر کے انتقال یا اس کے طلاق دینے کے بعد دوسری شادی کر لی ہو، یعنی اس عورت نے دو یا اس سے زیادہ شادیاں کی ہوں تو وہ جنت میں اپنے کس شوہر کے ساتھ رہے گی؟

اس بارے میں مختلف اقوال ہیں 1 :- اس عورت کو اختیار دیا جائے گا کہ جس کے ساتھ اس کی زیادہ موافقت ہو اس کو اختیار کر لے۔ ۲- وہ عورت آخری شوہر کے ساتھ رہے گی۔ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عورت کو اس کا آخری شوہر ملے گا۔ 3- عورت اس شوہر کے ساتھ رہے گی جس نے دنیا میں اس کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا ہو اور وہ شوہر جس نے عورت پر ظلم کیا ہوگا، اس کو تنگ کیا ہوگا، وہ اس عورت سے محروم رہے گا۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کسی کے دو شوہر ہوں تو وہ جنت میں کس کے ساتھ رہے گی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے اختیار دیا جائے گا، پس وہ اس شوہر کو اختیار کرے گی جس نے دنیا میں اس کے ساتھ اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا ہو، اور وہی اس کا جنت میں شوہر ہوگا، اے ام سلمہ! اچھے اخلاق والے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے گئے۔ 4- بعض حضرات نے یوں تطبیق دی ہے کہ اگر سب شوہر حسنِ خلق میں برابر ہوں تو آخری شوہر کو ملے گی، ورنہ اسے اختیار دیا جائے گا۔ اور اگر عورت کنواری ہو، یعنی اس کا شادی سے پہلے ہی انتقال ہو گیا ہو، یا شادی شدہ تو ہو، لیکن اس کا شوہر جنتی نہ ہو تو جنت میں جس مرد کو بھی وہ پسند کرے گی، اس کے ساتھ اس کا نکاح ہو جائے گا، اور اگر موجودہ لوگوں میں کسی کو بھی پسند نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک مرد جنت میں پیدا فرمائیں گے جو اس کے ساتھ نکاح کرے گا۔

باقی یہ خواہش کہ ایک عورت بیک وقت کئی مردوں کی بیوی ہو خلافِ فطرت بھی ہی اور جنت میں یہ خواہش پیدا بھی نہیں ہوگی۔ ''المعجم الأوسط للطبراني'' میں ہے:

"قال: خطب معاوية بن أبي سفيان أم الدرداء بعد وفاة أبي الدرداء، فقالت أم الدرداء: إني سمعت أبا الدرداء يقول: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: أيما امرأة توفي عنها زوجها، فتزوجت بعده فهي لآخر أزواجها۔ وما كنت لأختارک على أبي الدرداء۔"(المعجم الأوسط للطبراني: ۳/۲۷۵، من اسمه بکر، برقم: ۳۱۳۰، ط: دار الحرمين، القاهرة)

"عن أم سلمة، قالت: قلت: يا رسول الله! أخبرني عن قول الله "حُوْرٌعِيْنٌ"، قال: "حور: بيض، عين: ضخام العيون شقر الجرداء بمنزلة جناح النسور"، قلت: يا رسول الله! أخبرني عن قوله: "كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ"، قال: "صفاؤهم صفاء الدر في الأصداف التي لم تمسه الأيدي". قلت: يا رسول الله! أخبرني عن قوله: "فِيْهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ"، قال: "خيرات الأخلاق، حسان الوجوه". قلت: يا رسول الله! أخبرني عن قوله: "كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ"، قال: "رقتهن كرقة الجلد الذي رأيت في داخل البيضة مما يلي القشر وهو العرفي". قلت: يا رسول الله! أخبرني عن قوله: "عُرُباً اَتْرَاباً"، قال: "هن اللواتي قبضن في دار الدنيا عجائز رمضاء شمطاء خلقهن الله بعد الكبر، فجعلهن عذارى عرباً متعشقات محببات، أتراباً على ميلاد واحد". قلت: يا رسول الله! أنساء الدنيا أفضل أم الحور العين؟ قال: "بل نساء الدنيا أفضل من الحور العين، كفضل الظهارة على البطانة". قلت: يا رسول الله! وبما ذاک؟ قال: "بصلاتهن وصيامهن وعبادتهن الله، ألبس الله وجوههن النور، وأجسادهن الحرير، بيض الألوان خضر الثياب صفراء الحلي، مجامرهن الدر، وأمشاطهن الذهب، يقلن: ألا نحن الخالدات فلا نموت أبداً، ألا ونحن الناعمات فلا نبؤس أبداً، ألا ونحن المقيمات فلا نظعن أبداً، ألا ونحن الراضيات فلا نسخط أبداً، طوبى لمن كنا له وكان لنا"، قلت: يا رسول الله! المرأة منا تتزوج الزوجين والثلاثة والأربعة ثم تموت فتدخل الجنة ويدخلون معها، من يكون زوجها؟ قال: "يا أم سلمة! إنها تخير فتختار أحسنهم خلقاً، فتقول: أي رب إن هذا كان أحسنهم معي خلقاً في دار الدنيا فزوجنيه، يا أم سلمة! ذهب حسن الخلق بخير الدنيا والآخرة۔"(۲۳/۳۶۷، أزواج رسول الله ﷺ، أم سلمة، ط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة)

"وقوله: "وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوٰجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ" أي: يجمع بينهم وبين أحبابهم فيها من الآباء والأهلين والأبناء، ممن هو صالح لدخول الجنة من المؤمنين؛ لتقر أعينهم بهم، حتى إنه ترفع درجة الأدنى إلى درجة الأعلى، من غير تنقيص لذلک الأعلى عن درجته، بل امتنانا من الله وإحسانا، كما قال تعالى: "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ"(تفسير ابن كثير: ۴/۴۵۱) ماخوذ دار الافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

افسانہ

ماں جی

(پہلی قسط) قدرت اللہ شہاب

کہانی کی کہانی

یہ کہانی ایک ایسے فرد کی ہے، جو اپنی ماں کی موت کے بعد اس کی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچتا ہے۔ سادگی پسند اور خوبصورتی کی مورت اس کی ماں، جس نے کبھی کوئی شوق نہیں کیا، کبھی کسی پر بوجھ نہیں بنی اور نہ ہی کسی کو دکھ دیا۔ خرچ کے لیے روپے مانگے تو بس گیارہ پیسے۔ وہ بھی مسجد کے چراغ میں تیل ڈلوانے کے لیے۔ ایک دن وہ اچانک یوں ہی چلی گئی۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہ ہوسکا۔ جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا، پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لئے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آرہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو ''بار'' کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔ ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہوگئی۔

روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دئے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہئے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی کی مزدوری کرنے لگے۔ انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔

نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہوگئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح

راستہ کسی کو نہ آتا تھا جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پوچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پاپیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔

یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی پرچہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقرعید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین آنے بطور عیدی دئے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آسکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے، پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔

جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے تو وہ فوراً مسجد میں تیل بھجوا دیتیں۔ ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔

رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے تھے۔ وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کے تیل کے لئے جمع کر رکھے تھے چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔ ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی اور نہ کوئی زیور۔

اسبابِ دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے لئے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن، دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکئے کے نیچے رکھا رہتا تھا۔ تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لئے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لئے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی بنا کر انہیں جائے نماز میں لپیٹا۔ جاڑوں میں اونی فرداور گرمیوں میں ململ کی دوپٹے کی بکل ماری اور جہاں کہیئے چلنے کو تیار۔ (جاری)

طب وصحت

گہری اور پرسکون نیند کیسے حاصل کی جائے؟

ادارہ

اگرچہ ماہرین ابھی تک صحیح طور پر معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے کہ انسانی جسم کیلئے نیند کیوں ضروری ہے لیکن اس امر پر سب متفق ہیں کہ کم سونا یا نیند میں بے قاعدگی کسی بھی انسان کی ذہنی اور جسمانی کارکردگی کو بُری طرح متاثر کرتی ہے۔ ذہنی اور جسمانی مستعدی کیلئے کتنی نیند درکار ہے؟ اس کا انحصار کئی عوامل پر ہوتا ہے مثلاً کام کی نوعیت وغیرہ۔ شیر خوار بچے ایک دن میں سولہ گھنٹے تک سو سکتے ہیں۔ نوجوان بچوں کیلئے نو گھنٹے اور بالغ افراد کیلئے سات سے آٹھ گھنٹے کی نیند ان کی جسمانی ضروریات کے لحاظ سے کافی ہوتی ہے۔ معمر افراد کو اگرچہ اتنی ہی نیند کی ضرورت ہوتی ہے جتنی کہ ایک نوجوان بالغ بچے کو، لیکن عموماً وہ مختصر وقفوں کیلئے سوتے ہیں اور بہت دیر تک گہری نیند کے مرحلے میں نہیں رہتے۔ 65 سال سے زائد عمر کے تقریباً پچاس فیصد بزرگ نیند کے کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

نیند کے خصوصی ماہرین ان تمام مریضوں کیلئے چند تجاویز پیش کرتے ہیں جو کہ نیند سے متعلق مختلف عوارض میں مبتلا ہیں۔ اپنا ایک نظام الاوقات مقرر کر لیجئے اسی کے مطابق ہر روز سونے اور جاگنے کو اپنا معمول بنائیں حتیٰ کہ چھٹی کے دنوں میں بھی اسی پر عمل کریں۔ ہر روز ورزش کریں لیکن سونے سے پہلے ورزش سے گریز کیجئے۔ ورزش کا بہترین وقت صبح اور سہ پہر کا ہے تاہم رات کے کھانے کے بعد ہلکی چہل قدمی معدے کو بوجھل ہونے سے بچاتی ہے۔ چائے، کافی، سگریٹ نوشی اور الکوحل سے پرہیز کریں۔ ایسی اشیاء جن میں کیفین موجود ہو ان کا استعمال ہونے سے کم از کم چھ گھنٹے قبل کر لینا چاہیے تاکہ دوران خون میں ان کے اثرات کم ہو جائیں۔ اپنے آپ کو پرسکون کرنے کیلئے سونے سے پہلے کچھ ایسے معمولات اپنا لیں جو کہ نیند لانے میں مددگار ہوں مثلاً گرم پانی سے غسل کرنا یا کسی اچھی سی کتاب کا مطالعہ کرنا مفید ہو سکتا ہے۔ سونے کے کمرے کو آرام دہ بنائیے، بہت ٹھنڈا یا گرم کمرہ بھی نیند خراب کرنے کا باعث بنتا ہے۔ بیڈ روم سے ٹی وی اور کمپیوٹر اٹھا دیجئے جب آپ کو نیند آ رہی ہو تو زبردستی اپنے آپ کو مت جگائیے۔ اپنے آپ کو روشنی کی موجودگی میں جاگنے کا عادی بنائیں۔ اُٹھتے ہی کمرے کے پردے یا بلائنڈ ہٹا دینے سے ٹائمر کلاک اپنے آپ کو اس روشنی کے مطابق سیٹ کرتا ہے اور اندھیرا ہوتے ہی یہ آپ کے دماغ کو سونے کے پیغامات بھیجنا شروع کر دیتا ہے۔ قدرت کے نظام میں رات آرام کیلئے بنائی گئی ہے سونے کے وقت سونا اور علی الصبح جاگنا ذہنی اور جسمانی مستعدی کیلئے بہت ضروری ہے۔ راتوں کو بلاوجہ جاگ کر اس نظام کو بغاوت کا موقع مت دیں۔

خشخاش کا تیل کنپٹی پر ملنے سے جلد نیند آ جاتی ہے۔ اگر نیند نہ آ رہی ہو تو سرخ ٹماٹر کو کاٹ کر اس پر چینی چھڑک کر کھانے سے بے خوابی کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔ سر میں خشکی ہونے کی وجہ سے نیند نہ آئے تو تیل مالش کرنا بہت مفید ہے۔

جامعۃ السعادہ واسعاد البنات کیرانہ

شاخ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

''جامعۃ السعادۃ'' مغربی یوپی کے مردم خیز قصبہ ''کیرانہ،شاملی'' کا ایک عظیم ومنفرد ادارہ ہے۔جس کے مقاصد میں سے قرآن وحدیث کی ترویج واشاعت کے ساتھ،ایسے باصلاحیت رجال کار تیار کرنا ہے، جوملت اسلامیہ کی علمی، دینی اورفکری قیادت کا فریضہ انجام دے سکیں اوراپنی خوابیدہ قوم کو بیدار کرسکیں۔

یہ ادارہ ۱۴۲۸ھ سے علم کی شمع جلانے اوراس کی لوکو تیز کرنے میں مصروف ہے، بچوں اور بچیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ،عربی، اردو اور انگریزی زبان بولنے ولکھنے کی ان کے اندر صلاحیت پیدا کرنے اور صحیح ڈھنگ سے ان کی تربیت کرنے، نیز عوام الناس میں دینی بیداری پیدا کرنے اورانہیں اسلامی تعلیمات سے واقف کرانے کے لئے اس کے خصوصی تعلیمی وتربیتی پروگرام اورانتہائی علمی ووقیع ماہ نامہ ''تحقیقات اسلامی'' کی پابندی کے ساتھ اشاعت ایسے کارنامے ہیں کہ کم ہی ادارے اس قلیل مدت میں اس منزل کو حاصل کر پاتے ہیں۔جامعہ کی مستقل اپنی انتہائی خوبصورت ودیدہ زیب دومنزلہ عمارت ہے،جس میں تعلیمی،تربیتی اوردعوتی ۱۴ رشعبے قائم ہیں۔طلبہ کی ایک کثیر تعداد دارالاقامہ میں مقیم ہے جن کے قیام وطعام اورلباس وفوری علاج کا جامعہ کفیل ہے اوردیگر ہرطرح کی سہولیات انہیں فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جامعہ باضابطہ طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملحق ہے،اوردارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کے نصاب کے مطابق ثانویہ اولیٰ سے عالیہ ثانیہ تک کی تعلیم کے ساتھ حفظ مع تجوید،ناظرہ قرآن کریم،دینیات اورحکومت ہند سے منظور شدہ انگلش میڈیم اسکول کے تحت درجہ پانچ تک کی تعلیم ماہراساتذہ کی نگرانی میں جاری ہے۔

جب کہ بچیوں کی خصوصی تعلیم وتربیت کے لئے علاحدہ سے ''جامعہ اسعاد البنات'' قائم ہے۔اس کی بھی دومنزلہ انتہائی محفوظ،خوبصورت اور ہرطرح کی سہولیات سے مزین عمارت ہے۔بچیوں کی نگرانی اوران کی تعلیم وتربیت کے لئے باصلاحیت عالمائیں مامور ہیں،یہ ادارہ بھی باضابطہ طور پر ندوۃ العلماء سے ملحق ہے۔جس میں ندوہ ہی کے نصاب ونظام کے مطابق ازدرجہ پرائمری تادورہ حدیث شریف کی تعلیم جاری ہے،ساتھ ہی کمپیوٹر اوردست کاری (سلائی،کڑھائی،امورخانہ داری) بھی سکھائی جاتی ہے۔

جامعہ کی مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔مخیّر حضرات سے اپیل ہے کہ صدقات،زکوٰۃ اورعطیات کی رقوم سے جامعہ کا تعاون فرمائیں۔ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین

محمد عرفان ثاقب قاسمی
محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ،کیرانہ ضلع شاملی۔یوپی 247774
رابطہ نمبر 09319530768 / 8630449150

Tehqiqat-e-Islami

Post No. UP/MZN- 86/2015-17 RNI No: upurd/2011/42786
Kairana, Distt. Shamli (U.P) India
E-mail: tahqiqat-eislamia@yahoo.com
Website: www.jamiakairana.com
www.shariyahacademy.com , academy2016web@gmail.com

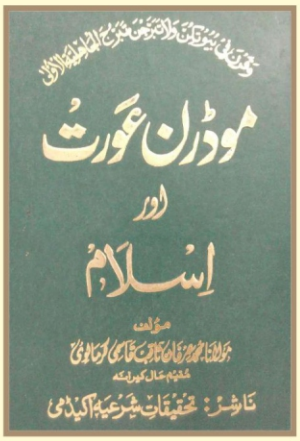

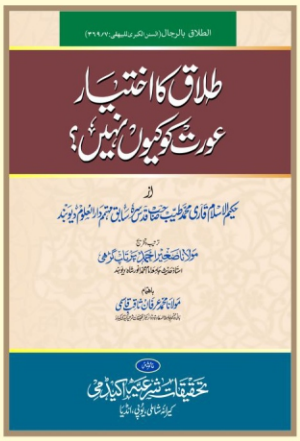

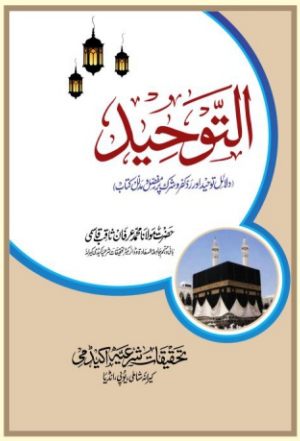

JAMIATUS SA'ADAH
Moh.Ibrahim Pura, (Aal Kalan) Shamli Road,
Kairana, Distt. Shamli U.P Pin: 247774
Mob: 09359602830, 09319530768